پیمانِ شب

اُردو غزلیات

پیر سیّد نصیر الدین نصیرؔ

گولڑہ شریف

مہریہ نصیریہ پبلشرز گولڑہ شریف، E-11 اسلام آباد (پاکستان)

اشاعت : سوم

تعداد : 1100

ترتیب : ڈاکٹر توصیف تبسّم، اسلام آباد

تزئین و کمپیوٹرائزڈ کمپوزنگ : مُرسلین احمد گولڑوی

معاونِ کتابت : ماسٹر منوّر حسین چشتی، کرنانہ (گجرات)

ناشر : مہریہ نصیریہ پبلشرز، گولڑہ شریف

نگرانیِ طباعت : ملک محمد مہربان، گولڑہ شریف

مطبع : عمران پرنٹرز، اسلام آباد

قیمت : -/168 روپے

سنِ طباعت : ذیقعدہ 1421ھ مطابق فروری 2001ء

ISBN 969 - 8537 - 02 - 3

ملنے کا پتہ :

اندرونِ ملک : مکتبۂ مہریہ نصیریہ، درگاہِ غوثیہ چشتیہ نظامیہ مہریہ گولڑہ شریف

E - 11 اسلام آباد، پاکستان۔ فون : 051-292814

E-mail: Meharali@paknet.com.pk

نیز : مکتبۂ ضیاء القرآن، گنج بخش روڈ، لاہور

فرید بک سٹال، 38- اُردو بازار، لاہور، پاکستان۔ فون 92-42-7312173

بیرونِ ملک : ڈاکٹر سیّد امتیاز حسین شاہ نقوی، 19 بینکس روڈ، سمال ہیتھ برمنگھم B10 9PP انگلینڈ۔ فون : 0044-121 6849101

قاری فضل رسول، جامعہ حنفیہ مہریہ اینڈ مُسلم سنٹر .INC، 32-13، گلی 57th وُوڈ سائیڈ، نیویارک۔ آفس: 418 ایوینیو، پی بروک لائن، نیویارک 11223

فون 718-274-7813 فیکس 385 718-3396 یو ایس اے

اُردو ادب کے نام

بر نمی آید بیاضِ چشمِ آہو از سواد
صبحِ اقبالِ جنونم نشکند پیمانِ شب

بیدلؒ

ہم اے سیماب! وہ مسند نشینِ مُلکِ معنیٰ ہیں
ہمارا ذکر ہوتا ہے ادب سے، بادشاہوں میں

علامہ سیماب اکبر آبادیؒ

اِس میں رچی بسی ہے مہک زلفِ یار کی
ہے دل کی دھڑکنوں کی امیں آج بھی غزل
مثلِ سَحَر لطیف ، مانندِ شب عمیق
شعلہ کبھی ، صبا کبھی ، شبنم کبھی غزل

حفیظ تائبؔ، لاہور

تارِ نَفَس

غزلیات

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

حرفِ گُفتنی

پیمانِ شب میری اُردو غزلیات کا مجموعہ ہے۔اِس سے پہلے ۱۹۸۲ء کے آغاز میں میری فارسی رباعیات کا مجموعہ آغوشِ حیرت اہلِ علم کی نگاہوں سے گزرا۔اُن کا سپاس گزار ہوں کہ اُنھوں نے کُھلے دل سے آغوشِ حیرت کی پذیرائی کی۔جو میرے لئے باعثِ مسرّت بنی۔ خیال تھا کہ فارسی زبان ملک سے ختم ہوچکی ہے ؛ مگر قدر شناسوں اور ناقدینِ فن کی تعداد دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ جو زبان ہماری تہذیب و ثقافت کو توانائی بخشتی ہے اور ہمارے وجدان کے لئے پیامِ زندگی ہے۔اُس کی طرف طبائع کا رحجان، دل خوش کُن انداز میں ہنوز باقی ہے۔اِس شیوۂ قدردانی اور ادائے اعتناء نے میری ڈھارس بندھائی اور فکر نے مولنا جاؔمی قدّس سرّہ السّامی کے درجِ ذیل شعر کا سہارا لے کر اُردو غزلیات اہلِ دل اور اہلِ علم کی خدمت میں پیش کرنے کی ہمّت بخشی ہے ؂

بیا جاؔمی رہا کن شرمساری
زصاف و دُرد پیش آر آنچہ داری

اُردو زبان سے میرے قلبی ربط اور موانست کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دس گیارہ برس کی عمر ہی سے مجھے شعرائے اردو کے سینکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ جنہیں میں دورانِ گفتگو مخاطب کے ذوق واستعداد کو دیکھتے ہوئے برمحل استعمال کیا کرتا تھا۔ حضرتِ بیدؔل علیہ الرّحمہ نے ذوق و شوق کو خالصتاً موہبتِ الٰہی قرار دیتے ہوئے کیا قرینِ حقیقت بات کہی ہے ؎

رمز آشنائے معنٰی ہر خیرہ سر نہ باشد
طبعِ سلیم فضل است ارثِ پدر نہ باشد

یعنی طبعِ سلیم محض فضلِ ایزدی ہے۔ یہ باپ دادا کی میراث نہیں ، جسے باہم تقسیم کیا جاسکے۔

القلیلُ کالمعدوم ہی سہی ، مگر جو معاملہ میرے ساتھ پیش آیا وہ محوّلہ بالا بیان کے بالکل برعکس ہے۔ مجھے ذوقِ علم وادب ورثے میں ملا۔ پردادا حضرت پیر مہر علی شاہ قدس سرّہٗ ، جدِّ امجد حضرت سیّد غلام محی الدّین المعروف (بابوجی) اور والد ماجد قبلہ پیر سیّد غلام معین الدّین صاحب المتخلّص مُشتاقؔ علیہم الرّحمہ کا شعرو سخن سے لگاؤ باخبر احباب کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اِس موروثی فیض کے علاوہ بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اکابرِ امّت اور اساتذۂ سخن مولنا رومیؒ، مولنا جامیؒ، خواجہ حافظ شیرازیؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ، طوطیٔ ہند امیر خسروؒ اور میرزا عبدالقادر بیدلؒ ایسے نابغۂ روزگار نفوس کے کلام نے میرے توسنِ فکر کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ اگرچہ اِن اکابر کے علوِّ فکر اور عفّتِ خیال کا جہان ہی کچھ اور ہے ؏

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

تاہم بحمد اللہ قدرت نے مجھے اِس حجازی خم خانہ کے پاک نگاہ بادہ نوشوں کی خمار نواز آنکھوں سے کیف و مستی کی خیرات عطا کی ہے۔ لہٰذا ؎

بچشمِ کم مبیں ہرگز نصیرؔ چاک داماں را
کہ شامِ زندگی روشن تراز صبحِ الستستش

مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ اساتذۂ متقدّمین نے محاورہ بندی، بیان کی ندرت، لب ولہجہ کی جاذبیّت اور معنٰی آفرینی میں انتہائی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی ماہرانہ چابک دستی اور اپنے استادانہ اندازِ اظہار سے اُردو زبان کو کچھ سے کچھ بنادیا۔ چنانچہ میر انیسؔ کہتے ہیں ؎

مِری قدر کر اے زمینِ سخن !
تجھے بات میں آسماں کر دیا

اگر وہ لوگ زبان کے محاورات اور ضرب الامثال کو دلنشین و مطبوع انداز میں محفوظ نہ کر لیتے تو آج خواص بھی رنگین اور دل نواز قسم کی اُردو نہ بول سکتے اور زبان کے مزاج و عرفان سے بھی محروم رہتے۔ بلاشبہ اِن اساتذہ نے اُردو زبان کے اساسی محاسن کو ملحوظ رکھ کر اسے صدائے بے معنٰی بننے سے بچالیا۔ اُردو ادب ہمیشہ اِن اساتذۂ قدیم کا مرہونِ منّت رہے گا اور قیامت تک اُردو پر انہی کی چھاپ رہے گی۔

خطا معاف! آج کل جو اہلِ قلم زبان و بیان کے سلسلے میں اساتذۂ اردو کے متفقہ اور مسلّمہ اصولوں سے انحراف و اعراض کرتے ہوئے نظم و نثر لکھتے ہیں، اُن کا پیرایۂ اظہار ہیئتِ مجموعی کے اعتبار سے نہایت بے ڈھب اور غیر مانوس لگتا ہے۔

یہ حضرات غیر مستند اور خود ساختہ محاورات سے اپنے ہم مشرب معاصرین کو عارضی طور پر مرعوب کر کے وقتی داد و تحسین تو لے سکتے ہیں؛ مگر ان کی یہ بے راہ روی کسی روز نئی نسل کو تشکیک و ارتیاب کے دلدل میں پھنسا دے گی۔

الفاظ کے انتخاب و استعمال، زبان کے لب و لہجہ اور محاورات کی اہمیت و مقام کو سمجھنے کے لئے آخری وحیِ الٰہی سے استناد ازبس ضروری ہے۔ اِس کلام مبارک میں عرب کی مروّجہ زبان استعمال ہوئی اور استعمال شدہ محاورات، ضرب الامثال، لب و لہجہ اور زبان و بیان کے تمام اصول عرب کے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اِن تمام اُمور سے ہٹ کر ایک بالکل جدید ڈکشن (انداز) کی طرح ڈال دی جاتی، جسے فصحائے عرب ایک مدّت تک سیکھتے اور پھر خلّاقِ عالم کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتے۔ لیکن اِس صورت میں منکرین یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ ہماری مروّجہ زبان نہیں۔ اِس میں وہ الفاظ، محاورات، لب و لہجہ اور فصاحت و بلاغت موجود نہیں جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہے۔ اگر قادرِ مطلق ہماری زبان کے مروّجہ اصول و مبادیات کو سامنے رکھتے ہوئے کلام نازل فرماتا تو ہم متوجّہ بھی ہوتے۔ چنانچہ خداوندِ عالم نے باہمہ قدرتِ کاملہ اِن کے تمام لسانی لوازم کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ اعلان فرمایا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (میری ایک نازل کردہ سُورت کی مثل کوئی سُورت کہہ کر لاؤ) خداوندِ علیم کو علم تھا کہ اِس رعایت کے باوجود عرب کسی صورت میں میری نازل کردہ کسی سُورت کا جواب نہیں لا سکتے۔ یا دوسرے لفظوں میں ؎

یہ کہہ کر اُس نے آئینہ لگایا روزنِ در میں
کہ اپنا مُنہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

حاصل کلام یہ کہ جب قادرِ مطلق نے ایک زبان کی پابندی کی ہے اور ایک روایت کو اپنایا ہے درآنحالیکہ وہ ہر پابندی اور روایت کی پیروی کرنے سے بے نیاز و منزّہ ہے تو پھر ایک عبد عاجز کیوں کر کسی زبان کے بنیادی حقوق پورے کئے بغیر اُس کا ماہر اور استاد کہلانے کا استحقاق رکھ سکتا ہے۔

شعر بیان مسائل کے لئے نہیں ہوتا اور اگر کسی شعر میں جذبۂ خالص کی آمیزش کے بغیر کوئی مسئلہ پیش کیا جائے تو وہ شعر خود ایک مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے اور اس سے لطافت شعری مفقود ہو جاتی ہے۔ اہل فن نے شعر کی مختلف تعریفات کی ہیں۔ میرے نزدیک شعر کا بنیادی وصف یہ ہے کہ ذہن اُس سے ذوق حاصل کرے خواہ اُس میں بیان کردہ مضمون کا تعلق معقولات سے ہو یا قصۂ گل و بلبل سے، حسن یار یا غم یار سے یا آن کل کے رجحان غالب کے مطابق غم روزگار سے۔

حضرت مولانا جامی قدس سرّہ السامی فرماتے ہیں ؎

گر عشقِ حقیقیست وگر عشقِ مجاز است
مقصود ازیں ہر دو مرا سوز و گداز است

بس یہی سوز و گداز اور یہی جاں نواز باطنی لطف شعر کا حقیقی مقصود ہے۔ رومیؒ، عرفیؒ، صائب تبریزیؒ، غنی کاشمیریؒ، میرزا عبدالقادر بیدلؒ، غالب دھلویؒ اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے اشعار میں جابجا دقیق مباحث اور فلسفیانہ مسائل بیان کئے ہیں اور دل و جاں کی تیز آنچ دے کر ان مضامین بلند سے ادبیاتِ عالیہ کی تخلیق کی ہے۔ آیۂ کریمہ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ کہ الہام کا نزول قلب پر ہوتا ہے؛ دوسرے

الفاظ میں دل سے نکلنے والی بات اہام کا درجہ رکھتی ہے۔

اساتذۂ اردو میر تقی میر، انیس لکھنوی، مصحفی، خواجہ آتش، حضرت امیر مینائی، استاد ذوق، غالب اور داغ دہلوی نے الفاظ و علامات کو آتش دل سے گزار کر کلام کو پُر تاثیر بنایا اور انہیں معنویت سے لبریز کر دیا۔ اب ان اساتذہ نے اردو زبان کو جو ورثہ عطا کیا ہے، اُسے نظر انداز کر کے کوئی شخص اربابِ شعر و سخن کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ ورثہ آناً فاناً قبضے میں نہیں آ جاتا؛ بلکہ اس کے لئے لگاتار محنت اور مسلسل مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خود سے چل کر یہ نہیں طرزِ سخن آیا ہے
پاؤں استادوں کے دابے ہیں تو فن آیا ہے

بحمد اللہ میں نے اِنہی اساتذہ سے اُردو زبان سیکھی ہے اور ان کا سپاس گزار ہوں؛ اسی باعث میرے اُسلوبِ سخن میں ان اساتذۂ متقدمین کے واضح اثرات موجود ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ جو اُسلوب ان اثرات سے عاری ہے، وہ میرے نزدیک بے معنی اور بے حقیقت ہے۔ میری غزلیات میں اساتذۂ قدیم کی روایتی علامات جام و سبو، پیمانہ و میخانہ اور رند و ساقی موجود ہیں، زاہد، واعظ اور سبحہ و زنّار کا ذکر بھی ملتا ہے، یہ سب باتیں غزل کی دیرینہ روایت کی غمازی کرنے کی حد تک استعمال ہوئی ہیں۔ طنزِ ملیح، شکوہ طرازی اور شوخی شرارت غزل کی جان ہے، اگر ان سے صرف نظر کیا جائے تو غزل حدیثِ دلبراں نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں میری غزلیات میں نسبت سے متعلق اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ چونکہ میں ایک خانقاہ کا فرد بھی ہوں، اس لئے نسبتوں کا یہ سلسلہ میرے کلام میں اکثر جھلکتا رہتا ہے اور جب خلوص ادبی تخلیقات کا بنیادی وصف شمار ہوتا ہے تو اس لحاظ سے دل کی دھڑکنوں اور قلبی کیفیّات کو غزل سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔

گولڑہ شریف میں اعراس کی تقریبات کے مواقع پر میری طرف سے مختصر و محدود مشاعروں کا اہتمام بھی ہوتا تھا اور ہر بار طرحی غزل کہنا پڑتی تھی۔ ایسی غزلوں میں نئے انداز میں شعر کہنے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر کہیں اساتذۂ اُردو کے کلام سے ملتا جلتا کوئی مصرع نظر آتا ہے تو وہ توارد محض ہے۔ اساتذہ کی نئی زمینوں میں قافیہ و ردیف مزاج کی وقتی کیفیت کی انعکاسی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے غزل اپنے اندر یہی کیفیت رکھتی ہے؛ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ غزل کے تمام اشعار میں فکر اور کیفیت کی یکسانیت موجود ہو، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک نشست میں پوری غزل کہنا امرِ محال ہوتا ہے اور پھر جب نئی نشست کا موقع آتا ہے تو ہوا کے جھونکے کی طرح سابقہ موڈ مفقود ہو چکا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں غزل اپنی فطرت کے اعتبار سے بھی ایک شعر میں مکمّل مضمون اور ایک نئی کیفیّتِ مزاج رکھتی ہے؛ لیکن میری ایک مجبوری بھی ہے کہ جب فکرِ سخن میں مجھ پر محویّت طاری ہوتی ہے تو احباب سلسلہ اچانک وارد ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ خانقاہ مرجعِ خلائق ہوتی ہے اور لوگ اپنے دکھ درد کی کہانیاں لے کر آتے ہیں؛ ایسے میں اُن کی طرف متوجّہ نہ ہونا روایاتِ طریقت کے منافی متصوّر ہوتا ہے اور شعر گوئی نے تو دردمندیِ طبع اور لینتِ مزاج میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ ملاقاتیوں کے جانے کے بعد خیالات و افکار کے تار و پود کو دوبارہ جوڑنا اور فکر کو ازسرِ نو مرتکز

کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے، اِسی بنا پر میری غزل، خیالات اور کیفیات کی گونا گونی کا مظہر بن جاتی ہے خدا لگتی تو یہ ہے کہ ایسے ماحول میں میرا شعر کہہ لینا، موہبتِ ربّانی اور تصرّفِ رجالِ روحانی کے سوا کچھ نہیں۔

میں اشعار کا انتخاب قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ بعض احباب انتخاب کے سلسلے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں؛ مگر میں اِس کے خلاف ہوں۔ کیوں کہ بسا اوقات جن اشعار کو شاعر اپنے کلام سے خارج کر دیتا ہے؛ وہی قارئین کو پسند ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علّامہ اقبال علیہ الرّحمہ نے اپنا یہ لطیف و بلیغ شعر اپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا:-

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ہر شخص کی پسند کا معیار جداگانہ ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شاعر کو اپنا جو شعر پسند ہو وہی قارئین کے ذوق پر بھی تازیانے کا کام کرے۔ اِس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک میزبان دستر خوان پر انواع و اقسام کے کھانے چن دیتا ہے، لیکن مہمان وہی کھاتے ہیں، جو اُن کے کام و دہن کے انتخاب کی زد میں آتا ہے۔ اُنھیں میزبان کی ترجیحات کی جانب ہرگز التفات نہیں ہوتا۔ اشعار کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ قارئین اپنی ذہنی و قلبی افتاد کے مطابق اشعار چنتے ہیں اور اُن پر سر دُھنتے ہیں۔ اب تک اسلوبِ جدید کے متعلّق کچھ عرض نہیں کیا گیا۔ قدیم کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کے بعد میری نگاہ شروع ہی سے جدید نگارشات کی طرف رہی ہے۔ بدلتے ہوئے تقاضوں کی وجہ سے زبان ہمیشہ اپنے دامن میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ جس کا احترام خواص و عوام کے لئے ضروری ہے۔ زبان میں ذخیرۂ الفاظ اور تنوّع اسالیب کے اعتبار سے آئے دن مستقل طور پر عملِ ارتقاء جاری رہتا ہے، اِس کی حیثیت روشنی اور تازہ ہوا کی ہے؛ جو ادیب و شاعر اِس عمل کے صالح عناصر کی طرف متوجّہ رہتے ہیں؛ اُن کے طرزِ تحریر میں ارتقاء پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے اِس حقیقت کو ہمیشہ ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ اِس لئے توقّع ہے کہ ناقدینِ فن اِس لحاظ سے بھی میری غزلیات قابلِ اعتناء پائیں گے۔

مزید ایک بات کہہ کر اپنا معروض ختم کرتا ہوں کہ گولڑہ شریف کے علاقہ میں پنجابی کا ایک خاص لہجہ مروّج ہے؛ یہاں رہتے ہوئے لکھنؤ اور دلّی کا محاورۂ اُردو استعمال کرنا کارِ ہر دیوانہ نیست۔ یوں سمجھیے کہ اگر کوئی دہلوی یا لکھنوی شاعر پنجابی زبان میں ایسے شعر کہے کہ اُس پر بلّھے شاہؒ، سلطان باہوؒ، مصنّفِ سیف الملوک میاں محمد بخشؒ اور پیر فضل شاہ گجراتیؒ ایسے اکابرِ پنجابی کے کلام کا گمان ہونے لگے تو اُس لکھنوی یا دہلوی شاعر کے حق میں رطب اللّسان نہ ہونا بھی قرینِ دیانت و انصاف نہ ہوگا۔ اِن معروضات کے بعد آخر میں حضرتِ بیدلؔ قادریؒ کا یہ برجستہ و قرینِ مدّعا شعر درج کر دینا مناسب لگتا ہے:-

بہ کلامِ بیدلؔ اگر رسی مگذر ز جادۂ منصفی
کہ کسے نمی طلبد ز تو صلۂ دگر، مگر آفریں

فقیر نصیر الدّین نصیرؔ کان اللہ لہٗ
گولڑہ شریف
اسلام آباد

14ر نومبر 1982ء

از صاحبزادہ پیر سید ظفر قادری صاحبؒ
آستانۂ عالیہ قادر بخش شریف (کمالیہ) ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

نگینوں کی تلاش

کِھلتا ہُوا گورا رنگ۔ کانوں کی لوؤں تک آتی ہوئی گھنگھریالی زُلفیں۔ سلیقے سے ترشی ہُوئی سیاہ داڑھی اور چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ذہین، چمکدار اور خوبصورت آنکھیں۔ کتابوں میں گِھرا ہُوا ایک وجُود۔ اپنے آگے پان دان دھرے، تہبند باندھے سادہ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہُوا ایک سُبک جسم۔ یہ ہے وہ تصوّر جو نصیؔر کا نام سنتے ہی ذہن کے پَردے پر اُبھرتا ہے۔

نصیؔر بھائی سے میری مُلاقات ایک عرصے سے ہے۔ مگر پہلی مُلاقات کا خوشگوار تاثّر جو میرے احساسات میں اُترا تھا۔ آج تک اُسی طرح قائم ہے۔ جب بھی اُن سے مُلاقات کا اِتّفاق ہوتا ہے۔ مَیں اُن سے سادہ پان کھانے کی فرمائش کرتا ہوں۔ مگر یہ صرف مَیں ہی جانتا ہوں۔ کہ پان کھانے کی فرمائش تو ایک بہانہ ہے۔ مقصود اُن کے پان دان کا ڈھکنا کُھلوانا ہوتا ہے۔ جس کے کُھلتے ہی شعر و سخن کے دریچے وا ہو جاتے ہیں اور وہ وہ پُھول کِھلتے ہیں کہ رُوح تک مُعطّر ہو جاتی ہے۔

نصیر الدّین نصؔیر کے دادا جی حضرت سیّد غلام محی الدّین قدّس سرّہٗ المعروف بابوجیؒ جو اعلیٰ حضرت سیّد پیر مہر علی شاہ قدّس سرّہ العزیز کے بعد گولڑہ شریف کے رُوحِ رواں اور تصوّف کے اُفق کا ایک روشن ستارہ تھے، راقم الحروف پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ میرا اُن سے تعلّقِ خاطر جیسا اُن کی پاکیزہ زندگی میں تھا، آج بھی ہے اور عُمر بھر رہے گا۔ اُن کی باتیں اور مُلاقاتیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ میرے مہربان اور بزرگ دوست شورؔش کاشمیری مرحوم، اُستاد محترم جناب احسان دانشؔ اور مَیں کئی مرتبہ اکٹھے (بابوجیؒ) کی محفل میں شریک ہوتے تھے۔ جو غذائے رُوح اور تسکینِ قلب اُن کے پاس بیٹھ کر ملتی تھی، آج اُس سے محرومی جاں گُسل ہے۔

وہ ہستیاں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

جن لوگوں نے (بابوجیؒ) کو دیکھا ہے یا جنہیں اُن کا قرب حاصل رہا ہے، میرے ساتھ یقیناً اتّفاق کریں گے کہ نصیؔر کو دیکھتے ہی (بابوجیؒ) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھوں سے نصیؔر کی تربیت کی۔ جس کا ثمر آج ہمارے سامنے ہے۔ بیک وقت عربی، فارسی اور اُردو زبان پر یکساں عُبور۔ پھر اِن تینوں زبانوں میں شعر کہنے کا فن نصیؔر کی شخصیت کا نشانِ امتیاز ہے۔ اِس نَو عمری میں کلام کی پُختگی قابلِ تحسین ہے۔ قدیم اساتذہ کا رنگ چُھپائے نہیں چُھپتا۔ اِن کا فارسی کلام ایک کُہنہ مَشق اُستاد کا کلام لگتا ہے۔ کہیں حافظؒ شیراز محبّت کی پر پیچ گلیوں میں مستی کے جام لُنڈھاتا نظر آتا ہے تو کہیں جامیؒ بارگاہ رسالت پناہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

میں عقیدت کے گجرے نچھاور کرتا دکھائی دیتا ہے۔

جب کبھی ہم ماضی کے آئینے میں جھانکتے ہیں تو برِصغیر پاک و ہند میں صُوفیا کے مکتبِ فکر کے تلامذہ کا ایک طویل قافلہ اپنے روشن روشن ناموں سے تاریخ کے صفحات کو منوّر کرتا نظر آتا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ جیسے عظیم موسیقار، شاعرِ طرحدار، خواجہ میر دردؒ جیسے دَرد مند قلم کار، بیدمؔ وارثی جیسے نعت گو اور خواجہ حسن نظامیؒ جیسے ادیب، غرضیکہ ایسے بہت سے نام ہیں جو اپنے سخنِ دلنواز سے خلقِ خدا کے دلوں کو گرماتے رہے۔ یہ سب حضرات صُوفیوں ہی کے حلقہ بگوش تھے اور اِسی مکتبِ فکر کا حصّہ تھے؛ مگر آج جب زمانۂ حال میں نظر ایسے نگینوں کی تلاش میں یہاں وہاں سفر کرتی ہے تو سوائے بے رنگ پتھروں کے کچھ نہیں پاتی۔ اِس دورِ پرآشوب میں اگر کہیں سے تازہ ہَوا کا ایک ہی جھونکا نصیب ہو جائے تو غنیمت ہے۔

وہ خانقاہی نظام جس نے اسلامیانِ پاک و ہند کو جادۂ حق پر مضبوط قدموں سے چلنا سکھایا، آج اُس کی اپنی چال میں لڑکھڑاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ اِن حالات میں جب نصیؔر جیسا جوانِ رعنا شعر و سُخن کی وادیوں میں پھول کھلاتا اور علمِ تصوّف کے بحرِ عمیق میں غوطے لگاتا نظر آتا ہے تو ٹوٹی آس بندھنے لگتی ہے اور اندر سے آواز آتی ہے۔ ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

یا پھر (اقبالؒ) دروازۂ دل پر دستک دیتے ہُوئے کہتا ہے۔ کہ ؎

مرا سبوچہ غنیمت ہے اِس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صُوفیوں کے کدو

ظفر قادری، لاہور

15/ دسمبر 1982ء

از جناب احمد ندیم قاسمی

پیمانِ شب کا ایک تاثّر

سیّد نصیر الدّین صاحب نصیؔر اُردو اور فارسی کے ایک نوجوان شاعر ہیں اور دونوں زبانوں میں اُن کی سخن وری نے پُورے ملک میں دُھوم مچا رکھی ہے۔ اس دُھوم کا سبب یہ نہیں ہے کہ سیّد صاحب گولڑہ شریف کے اُس آستانۂ عالیہ سے متعلّق ہیں جس کا ایک دُنیا احترام کرتی ہے۔ اِس کا واحد سبب اُن کا پاکیزہ اور اعلیٰ ذوقِ شاعری ہے۔

فارسی اور اُردو غزل، تصوّف کی گود میں پلی بڑھی ہے۔ تصوّف کی یہ روایت اتنی قدیم اور قوی ہے کہ یار لوگ خالصتاً مجاز کی شاعری کرنے والوں کے ہاں بھی حقیقت کی جُستجو میں لگے رہتے ہیں۔ اُردو کی جدید غزل میں مسائلِ تصوّف بہ ظاہر اِس قدر مقبول نہیں رہے۔ مگر تصوّف کی روایت ہمارے غزل گو شعراء کے خون میں رَچی بسی ہوئی ہے۔ اِس لئے وہ اِس روایت سے چاہے شُعوری طور پر کترائیں، کہیں نہ کہیں اُنہیں ذرّے میں صحرا، اور قطرے میں دریا دکھائی دے ہی جاتا ہے۔ کیا عجب سیّد نصیر الدّین صاحب کی برکت سے پسِ منظر میں جاتی ہوئی یہ روایت پھر سے پیشِ منظر میں آجائے اور آئندہ نسل نصیؔر صاحب کے لہجے میں اِس طرح کی شاعری کرنے لگے۔

دو عالم کے علاوہ کوئی عالم اور ہے شاید
اِن آئینوں میں وہ آئینہ گر دیکھا نہیں جاتا

تصوّف کی دلآویز کارفرمائیوں کی ایک جھلک سیّد نصیر صاحب کے ہاں دیکھئے ؎

دو جہاں چھوڑ! دل میں ڈھونڈ اُسے
دیکھ! موجود ہو یہیں نہ کہیں

بے خودی میں نہ ہوئی ہم کو نصیر اپنی خبر
ہوش آیا، تو ہمیں جلوۂ جاناں نکلے

جلوۂ ذات سے جو خالی ہو
کوئی ایسا بشر نہیں ملتا

پھر جب اُن کے کلام میں حقیقت و مجاز گلے ملتے ہیں تو اِس طرح کے پھول کھلتے ہیں ؎

وہ شوخ جب آیا تو پھر اِس شان سے آیا
جو صاحبِ خانہ تھے، وہ مہماں نظر آئے

ایک نوجوان بھرپُور شاعر کے ہاں عموماً جذبات کی فراوانی ہوتی ہے، مگر مَیں سمجھتا ہوں کہ سیّد نصیر صاحب کے معاملے میں اُن کے جذبات پر قدیم کلاسیکی لہجے اور غزل کی روایتی لفظیات کی نادرہ کاری نمایاں ہے۔ یہ جوان کے ہاں شیخ، زاہد، پارسا، ساقی، جام و سُبو، میخانے اور پینے پلانے کے تذکرے عام ہیں تو یہ سب غزل کی روایتی علامتیں ہیں۔ ساتھ ہی اِس لئے دیئے رہنے والے طرزِ اظہار میں اُن کے ماحول اور اُن کی تربیت کے اثرات بھی کارفرما ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

نظارۂ مہ وشاں سے پہلے
تطہیرِ نگاہ چاہتا ہوں

"پیمانِ شب" کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اِس مجموعے کی بیشتر غزلوں کی زمینیں سیّد نصیر صاحب کی اپنی ہیں اور بعض کی ردیفیں تو اُن کی ذہنی اُپج کا ایک دلچسپ ثبوت ہیں۔ پھر یہ ردیفیں غریب ہونے کے باوجود ہر شعر میں ماہرانہ اور فن کارانہ سلیقے سے کھپی ہوئی ہیں۔

سیّد نصیر اِس لحاظ سے بھی داد و ستائش کے مستحق ہیں۔ کہ فارسی شاعر ہونے کے باوجود اُنہوں نے فارسی پر اپنی دسترس کو، اپنی اُردو غزلوں کے شعروں پر مسلّط ہونے دیا ہو جبکہ ابتدا میں مرزا غالب تک اِس کمزوری کی زد میں آ گئے تھے۔ اس لئے ان غزلوں کی سلاست اور ساتھ ہی بلاغت میرے نزدیک حیرت انگیز بھی ہے اور مسرّت بخش بھی۔

25/ اکتوبر 1982ء

احمد ندیم قاسمی

از جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم

غزلیاتِ نصیؔر گولڑوی

پیر سیّد نصیر الدّین نصیؔر غزل کی کلاسیکی روایتوں میں پلے ہوئے شاعر ہیں لہٰذا اِن کی غزل سخن کی روایت کی پابند ہے۔ یہ روایت کیا تھی۔ ہماری مغرب زدہ سرسری تنقید تو اِسے محض قصّۂ گُل وبُلبل اور افسانۂ ہجر و وصال کہہ کر ٹال جاتی ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ روایت ایک حیادار اور وضع دار تہذیب کی ترجمان تھی، جس میں ایک نگاہِ دزدیدہ دلوں کے ہزاروں افسانے رقم کرسکتی تھی اور روایتوں کے شاعر کا کمال یہ تھا کہ ایما اور رمز کے ایک ہی لفظ یا استعارے کے ذریعے معانی کے ہزاروں جلووں کے گلزار سجا دیا کرتا تھا۔ طُولِ کلام کا جو عیب طرزِ جدید میں ہے' اِس سے یہ شاعری پاک تھی۔ ضبطِ نَفَس اور ضبطِ بیان دونوں ہمرکاب چلتے تھے۔ اِس میں نہ خندۂ دنداں نما تھا نہ گُفتارِ بے باک۔ یہ تو کچھ ایسا ماجرا تھا جو میر تقی میؔر پر گزرا تھا۔

اک نگہ، ایک چشمک، ایک سخن

ہے مگر اِس میں بھی تامّل سا

وہ شاعری (یا غزل) جسے روایت کی غزل کہا جاتا ہے۔ اِس میں شاعر کو تلمیذِ ربّانی کا صحیح استحقاق حاصل کرنے کے لئے اساتذۂ کبار کے طرزِ ادا، اُن کی زبان، اُن کا بیان، اُن کے تیور، اُن کا ایمائے خفی و جلی اور اُن کی بداغت و فصاحت اُن کی صُحبت میں یا اُن کے دواوِین کے ذریعے حاصل کرنا پڑتی تھی تاکہ اُن کا لب ولہجہ حاصل ہوسکے اور کلام کے مقامات سے کامل آگاہی حاصل ہوسکے...... اور پھر قدرتی شاعر (تلمیذِ ربّانی) اساتذہ کے محاورے میں اپنے منفرد حساسات کو بخوبی وخوش اسلوبی ڈھالنے پر قادر ہوسکے۔

اَلحَمدُ لِلّٰہ ! کہ اِس دَورِ بے زبانی وکج مج بیانی میں شاہ نصیؔر گولڑوی جیسے لوگ بھی جو تلمیذِ ربّانی ہونے کے باوجُود اساتذۂ کبار کے کلام کے بحرِ موّاج میں غوطہ زن ہوئے اُن سے بیان کا لُطف اور لب ولہجہ سیکھا اور پھر اُس میں فطرت کے گُل و گلستان سجائے گئے۔

غزل کی شاعری میں حُسن آفرینی اور معنٰی آفرینی کا ایک وسیلہ ردیف کا انداز ہے۔ اِس سے قدرتِ زبان کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ شعر میں بات بھی پیدا ہوتی ہے اور آواز و آہنگ کی لطافتیں بھی نمودار ہوتی ہیں۔ قدیم اساتذہ اِس تکنیک میں خاص کمال حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

نصیؔر گولڑوی کی غزلیات میں بھی ردیفوں کی شان پائی جاتی ہے۔ خصوصًا لمبی ردیفوں میں نسبتًا بیان اور موسیقی دونوں برنگِ خاص نمایاں ہیں۔

نصیر الدّین نصیؔر کے یہاں نکتے بکثرت ہیں۔ جن میں زندگی کی حقیقتوں اور قلب انسانی کی لطافتوں کو بہ اندازِ خوش پیش کیا گیا ہے۔ زبان کی شیرینی اور بیان کی خُوبی اُس پر مُستزاد ہے۔ عالمِ شباب میں کسی کی اِتنی پُختہ شاعری مَیں نے بہت کم دیکھی اور پڑھی ہے۔

2/اکتوبر 1982ء

فقط سیّد عبداللہ

از جناب سیّد رئیس امروہوی مرحوم

تقریظ

سیّد نصیر الدّین نصیرؔ ایک ممتاز ترین رُوحانی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ اِن کی قلندری اور درویشی میں کسے شُبہ ہو سکتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب کی فارسی رباعیات کا مطالعہ کریں تو عالم ہی دوسرا نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے قلب میں مرزا عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادیؒ کی آواز گونج رہی ہے اور اُن کے لہجے میں بیدلؒ ہی بول رہے ہیں۔

صاحبزادہ صاحب کی جو قلبی کیفیّت ہے، اُس کے پیشِ نظر بلکہ اُسی کے زیرِ اثر وہ غزل کہتے ہیں۔ نہ اُن کی زبان میں کوئی الجھاؤ ہے نہ طرزِ ادا میں کوئی پیچیدگی ۔

آغوشِ جنوں میں جا رہا ہوں
ہر غم سے نجات پا رہا ہوں
وہ ناؤ مجھی کو لے کے ڈُوبی
جس ناؤ کا ناخدا رہا ہوں

یہ کیفیّات قدرتی اور طبعی ہیں۔ ہر شخص اِس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ بلا شُبہ یہ عہد سخت کرب و کشمکش کا عہد ہے۔ اِس عہد کا انسان عجب قسم کی تنہائی اور رُوحانی خلا محسوس کر رہا ہے۔ اِس رُوحانی خَلا کی ترجمانی غزل میں طرح طرح ہو رہی ہے۔ لیکن اِس ترجمانی کو جذباتی پیچیدگی کا بہانہ نہیں بننا چاہیئے۔ آج کل بعض غزل گو شعرا کے اشعار میں جو ابہام، جو سایہ نما کیفیت اور زندگی سے گریز کی جو لاشعوری کوشش نظر آتی ہے، جدید غزل میں اس کا عکس واضح طور پر نمایاں ہے، لیکن اس طرح ہر شخص کا وجدانی تجربہ انفرادی اور شخصی ہو کر رہ گیا ہے اور ابلاغ و ارسال کی اُس لطافت سے محروم ہے جو شعر کی اساسی خصوصیّت ہے۔ کلامِ نصیرؔ کی خُوبی یہ ہے کہ وہ بلیغ ہے، تہ دار ہے اور واضح ہے۔ وُہ صفائی سے محسوس کرتے ہیں، اُسی دلرُبائی سے بیان کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جان پیاری تھی، مگر جان سے پیارے تم تھے
جو کہا تُم نے وہ مانا گیا، ٹالا نہ گیا
صرف اک بار نظر بھر کے اُنہیں دیکھا تھا
زندگی بھر مری آنکھوں کا اُجالا نہ گیا

محاوروں کے برمحل استعمال نے شعر کی برجستگی میں اور اضافہ کر دیا ہے ۔

دل تمہاری طرف سے صاف کیا
جاؤ ہم نے تمہیں مُعاف کیا
جان کر اُن سے بے رُخی برتی
ہم نے اپنا حساب صاف کیا

بے شک مبداءِ فیض اور تجلّیِ فیّاض کے فیضان کے بغیر شعر نہیں کہے جا سکتے اور مبداءِ فیض ہی سے صدائے غیب پیدا ہوتی ہے اور صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتا ہے۔

چھوٹی بحروں میں غزل کی نشتر آفرینی، عجب سماں، عجب لطف اور عجب عالم پیدا کر دیتی ہے۔ نصیرؔ صاحب کی چھوٹی بحر کی غزلیں، ایک تیز رفتار جوئبار کی

طرح ہیں جو تنگ کناروں کے فشار کے سبب نہایت تُندی، تیزی اور سرشاری کے ساتھ بہتی ہے۔

راہوں سے تری گزر رہا ہوں
انگاروں پہ پاؤں دھر رہا ہوں

اور کیا عجب شعر ہے کہ۔

ہے مدِّ نظر ترا تصوّر
آئینے سے بات کر رہا ہوں

قوافی کا لُطف دیدنی ہے۔

اُن سے ہر وقت مری آنکھ لڑی رہتی ہے
کیا لڑاکا ہے کہ لڑنے پہ اڑی رہتی ہے

جو کبھی خُونِ شہیداں سے حنا بند رہے
اب اُنہیں پُھول سے ہاتھوں میں چھڑی رہتی ہے

ایک اور طرح کا رنگِ تغزّل ملاحظہ ہو۔

لاکھ ڈُھونڈا مگر نہیں مِلتا
کوئی بھی ہم سفر نہیں مِلتا

ہم بھی اُس سے کبھی نہیں ملتے
کوئی ہم سے اگر نہیں مِلتا

اِسے سہلِ مُمتنع کہتے ہیں، یعنی دیکھا جائے تو بُہت آسان اور سادہ شعر معلوم ہو، اور کہنا پڑے تو آدمی بھونچکا رہ جائے۔ اِس شعر میں الفاظ کی ترتیب وہی ہے جو نثر کے کسی فقرے کی ہوتی ہے۔ یہ زبان پر غیر معمولی قدرت کا ثبوت ہے۔

صاحبزادہ نصیر الدّین نصیر کے جذبات اِس قدر قدرتی، طبعی اور فطری ہیں کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا اُس کے دل کی بات کہی جا رہی ہے۔

اُس کو چل پھر کے ڈُھونڈنے والو
وہ سرِ رہگزر نہیں مِلتا

کبھی کبھی خوبصورت ردیف کے استعمال نے پُوری غزل کو تابناک کر دیا ہے۔

جگمگانے لگی بام و دَر چاندنی
ہر طرف آ رہی ہے نظر چاندنی

اُن کے جلووں کی تشریح ممکن نہیں
سر بہ سر نُور ہیں سر بہ سر چاندنی

فرماتے ہیں اور اُس لطف و لطافت سے فرماتے ہیں۔

بلا کی نامۂ اعمال پر ہے گُل کاری
کسی کی ہوگی عبارت، مرا قلم تو نہیں

ردیف کا ایک اور خوبصورت استعمال توجّہ طلب ہے۔

یہ بزمِ بُتاں ہے نظاروں کی دُنیا
اداؤں کی بستی اشاروں کی دُنیا

ہمیں ہے فقیری میں شاہی مُیسّر
کہاں ہم، کہاں تاجداروں کی دُنیا

بلاشبہ پیر سیّد نصیر الدّین نصیر سلّمہ اللہ تعالیٰ کو فقیری میں تاجداری میسّر ہے۔ عجیب بات ہے کہ کسی زمانے میں خدامست درویشوں کے حجرے اور حق پرست

بزرگوں کی خانقاہیں، شعر و سخن، نکتہ سنجی و بذلہ طرازی، تخیّل آفرینی اور معنیٰ پژوہی کے مدرسے سمجھے جاتے تھے۔ مولانا رُومؒ سے لے کر حضرت مرزا عبدالقادر بیدؔل تک عرفاء کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس نے فارسی شاعری کو چار چاند لگا دیئے اور شعر کے پردے میں وہ نِکات و رُموز بیان کئے کہ اُن کی تفسیر کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں، لیکن آج بالعموم ہم یہ بات نہیں پاتے، "کس بمیدان در نمی آید سواراں را چہ شد" خانقاہوں کی رُوحانی پژمردگی کے اِس افسردہ کُن عالَم میں صاحبزادہ موصوف کی ذاتِ گراں مایہ سلامت رہے کہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کو اپنے جواہرِ فکر و تخیّل سے ثروت مند بنا رہے ہیں۔ اُن کی غزل کا مجموعہ "پیمانِ شب" اپنی تازہ بیانی، تخیّل کی طُرفگی، جذبات کی نفاست اور احساسات کی لطافت کے سبب اِن شاء اللہ ایک مقبول و دل پسند مجموعۂ سخن ثابت ہوگا۔

3 / اکتوبر 1982ء — رئیسؔ امروہوی

پیمانِ شب

1

◎

ترے پند و نصیحت مُحتَسِب وہ کیا سمجھتے ہیں
قیامت کو، جو اُن کا وعدۂ فردا سمجھتے ہیں

نہیں ہے احتیاجِ لب کشائی رُوبرو اُن کے
کہ اہلِ دل، زبانِ دیدۂ بینا سمجھتے ہیں

جو گُل کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں رُخِ گُلشن
وہ اربابِ نظر، قطرے کو بھی دریا سمجھتے ہیں

کوئی در پردہ کس سے چل رہا ہے کون سی چالیں
سمجھ ہر چند ناقص ہے، مگر اِتنا سمجھتے ہیں

نہ پوچھو کچھ کہ کیا کچھ دے دیا ہے دینے والے نے
بڑا ہو لاکھ کوئی، ہم کسی کو کیا سمجھتے ہیں

بہ ظاہر خوش تھے جو کل تک ہماری گُل فشانی پر
وہ اپنے بھی ہمیں اب راہ کا کانٹا سمجھتے ہیں

ترے دھوکے میں آنے کے نہیں ہم اے نفاق آرا!
ترے برتاؤ کو ہم خوب اے دنیا ! سمجھتے ہیں

نظر اُن کی نہیں اُٹھتی سرِ محفل مری جانب
کہ وہ میرے لبِ خاموش کا منشا سمجھتے ہیں

جو نکلیں جستجو کا شوق لے کر راہِ جاناں میں
وہ ہر منزل کو اپنے پاؤں کا چھالا سمجھتے ہیں

قیامت سر پہ جو ٹوٹے ، مصیبت دل پہ جو آئے
حقیقت میں اُسے ہم مرضیِ مولیٰ سمجھتے ہیں

لگا دی تُہمتِ بادہ کشی اُن پر بھی واعظ نے
نصیر اُن کی نظر کو جو مئے و مینا سمجھتے ہیں

◎

ہمیں جب کہ اپنا بنا لیا تو ہے ربط کس لئے ہم سے کم
یہ حجاب کیا ، یہ گریز کیوں ، رہیں سامنے تو وہ کم سے کم

غمِ آرزو ، غمِ جستجو ، غمِ امتحاں ، غمِ جسم و جاں
مری زندگی کی بساط کیا ، مری زندگی تو ہے غم سے کم

یہ مقامِ ناز و نیاز ہے ، مرا دل ہی محرمِ راز ہے
وہ نوازتے ہیں بہ مصلحت ہمیں التفات و کرم سے کم

ترے آستاں کا فقیر ہُوں ، مگر آپ اپنی نظیر ہُوں
مری شانِ فقر جہان میں نہ ملے گی شوکتِ جم سے کم

یہ کہا گیا ، یہ سُنا گیا ، یہ لکھا گیا ، یہ پڑھا گیا
نہ جفا ہوئی کبھی تم سے کم ، نہ وفا ہوئی کبھی ہم سے کم

وہی نسبتیں ، وہیں رفعتیں ، وہی رونقیں ، وہی عظمتیں
مرے دل میں جب سے وہ ہیں مکیں ، نہیں یہ مکاں بھی حرم سے کم

ترے ابروؤں کی حسیں کماں ، نظر آ رہی ہے فلک نشاں
نہ کرشمہ قوسِ قُزَح سے کم ، نہ کشش ہلال کے خم سے کم

نہ ستا مجھے ، نہ رُلا مجھے ، نہیں اور تابِ جفا مجھے
کہ مری متاعِ شکیب ہے ، تری کائناتِ ستم سے کم

یہ کرم ہے کم سرِ انجمن کہ پلائی اُس نے مئے سخن
مجھے پاس اپنے بُلا لیا ، رہی بات میری تو کم سے کم

نہیں جس میں تیری تجلّیاں ، اُسے جانچتی ہے نظر کہاں
ترے نُور کا نہ ظُہور ہو تو وجود بھی ہے عدم سے کم

کبھی انعکاسِ جمال ہے ، کبھی عینِ شَے کی مثال ہے
نہیں میرے دل کا معاملہ ، کسی آئنے کے بھرم سے کم

مہ و آفتاب و نُجوم سب ، ہیں ضیا فگن ، نہیں اِس میں شک
ہے مسلَّم اِن کی چمک دَمک، مگر اُن کے نقشِ قدم سے کم

یہی آرزو ، یہی مدّعا ، کبھی وقت ہو تو سُنیں ذرا
مری داستانِ حیاتِ غم جو لکھی گئی ہے قلم سے کم

یہ نصیرؔ دفترِ راز ہے ، یہ غبارِ راہِ نیاز ہے
کریں اِس پہ اہلِ جہاں یقیں ، نہیں اِس کا قول ، قسم سے کم

◎

خاکِ پا اُن کی جہاں بھی کہیں پائی جائے
دل یہ کہتا ہے کہ آنکھوں سے لگائی جائے

اُن کی تصویرِ ستم کیوں نہ دکھائی جائے
منظرِ عام پہ یہ شکل بھی لائی جائے

شُعلے اُٹھتے ہیں اگر دل میں ، نہ آنسو روکو
آگ لگ جائے تو لازم ہے بُجھائی جائے

اک نظر دید کی توفیق عطا ہو ہم کو
کچھ نہ کچھ حُسن کی خیرات لُٹائی جائے

گفتگو شیشہ و ساغر کی عبث ہے ساقی !
ہم وہ پیتے ہیں جو آنکھوں سے پلائی جائے

بار ہا کہہ تو چکے تم سے کہانی دل کی
کیا ضروری ہے کہ تحریر میں لائی جائے

آپ کیوں دل کی تمنّاؤں کو پامال کریں
رائگاں کیوں کسی بے کس کی کمائی جائے

حُسن کیا شے ہے، ادا کیا ہے، وہ خود کیسے ہیں
بات کُھل جائے گی، تصویر منگائی جائے

قیس و فرہاد کے افسانوں میں کیا رکھّا ہے
داستاں میری مجھی کو نہ سُنائی جائے

مجھ سے کہتا ہے نصیر اب کے برس جوشِ جنوں
کم سے کم، خاک بیاباں کی اُڑائی جائے

◎

رنگ لائے شامِ فُرقت اور بھی — ہے مجھے غم کی ضرورت اور بھی
دل پہ ٹوٹے گی قیامت اور بھی — ہجر کے کچھ دن ہیں حضرت اور بھی
آپ آئے ہیں تو بیٹھیں میرے پاس — اک ذرا تھوڑی سی زحمت اور بھی
عشق میں ہم جس قدر گرتے گئے — بڑھ گئی ہے قدر و قیمت اور بھی
شیخ نے رِندوں سے صلواتیں سُنیں — اس کی ہونی ہے بُری گت اور بھی
اُن کی باتیں، دل کی ہیں آئینہ دار — کُھل گئی ساری حقیقت اور بھی
ہاتھ میرے دل پہ رکھتے جائیے — جاتے جاتے یہ عنایت اور بھی
جس قدر وہ دُور ہم سے ہوگئے — بڑھ گئی اُن سے محبّت اور بھی

لے اُڑا ذوقِ سخن ہم کو نصیر
ہوگئی دُنیا میں شہرت اور بھی

◎

آتے نہیں، کہہ دیتے ہیں آنے کو یہاں، روز
مر مر کے جیا کرتے ہیں ہم دل زدگاں روز

سچ کہتے ہو، کرتے ہو کرم تم مری جاں! روز
ہاں ہاں وہ مرا گھر ہے پہنچتے ہو جہاں روز

رُخ عارض و کاکُل کے نکھرتے ہیں وہاں روز
یعنی سحر و شام بدلتا ہے سماں روز

تکتے ہیں تری راہ، ہمارے دل و جاں روز
ہوتا ہے صبا پر تری آہٹ کا گماں روز

اچھی نہیں یہ چھیڑ نسیمِ سحری کی
کیا فائدہ، کھلتی ہے جو غنچوں کی زباں روز

کہتا ہوں، سُنو گے مری رُودادِ محبّت
سُنتے نہیں اک بار، مگر کہتے ہیں "ہاں" روز

محفل میں تری غیر جو بیٹھا تو نہ اُٹّھا
ہم اُٹھتے ہیں، یا اُٹھتا ہے آہوں کا دُھواں روز

تا بر فلکِ حُسن رسیدی چو ہلالے
گشتم ز فدایانِ تو اے ماہ! "ازاں روز"

شاید ابھی سجدوں کی ضرورت ہے جُنوں کو
صحرا سے مرے کان میں آتی ہے اذاں روز

غیروں کی بُرائی کا گلہ ہوتا ہے مجھ سے
چھڑتا ہے یہ قصّہ بحدیثِ دگراں روز

اِک بار بھی آجائیں اگر آپ، بہت ہے
ہر دن ہو ملاقات، کہاں آپ، کہاں روز

تم اپنی جوانی کو نصیرؔ اُن پہ لُٹا دو
جو عشق میں بُوڑھا ہو، وہ رہتا ہے جواں روز

◎

اُٹھے نہ تھے ابھی ہم حالِ دل سُنانے کو

زمانہ بیٹھ گیا حاشیے چڑھانے کو

بھری بہار میں پہنچی خزاں مٹانے کو

قدم اُٹھائے جو کلیوں نے مسکرانے کو

جلایا آتشِ گُل نے چمن میں ہر تنکا

بہار پھونک گئی میرے آشیانے کو

جمالِ بادہ و ساغر میں ہیں رُموز بہت

مری نگاہ سے دیکھو شراب خانے کو

قدم قدم پہ رُلایا ہمیں مقدر نے

ہم اُن کے شہر میں آئے تھے مسکرانے کو

نہ جانے اب وہ مجھے کیا جواب دیتے ہیں

سُنا تو دی ہے اُنہیں داستاں "سُنانے کو"

کہو کہ ہم سے رہیں دُور، حضرتِ واعظ

بڑے کہیں کے یہ آئے سبق پڑھانے کو

اب ایک جشنِ قیامت ہی اور باقی ہے

اداؤں سے تو وہ بہلا چکے زمانے کو

شبِ فراق نہ تم آسکے نہ موت آئی

غموں نے گھیر لیا تھا غریب خانے کو

اسیرؔ! جن سے توقع تھی ساتھ دینے کی

تُلے ہیں مجھ پہ وہی اُنگلیاں اُٹھانے کو

◎

دِین سے دُور، نہ مذہب سے الگ بیٹھا ہوں
تیری دہلیز پہ ہُوں، سب سے الگ بیٹھا ہوں

ڈھنگ کی بات کہے کوئی، تو بولوں مَیں بھی
مطلبی ہُوں، کسی مطلب سے الگ بیٹھا ہوں

بزمِ احباب میں حاصل نہ ہُوا چین مجھے
مطمئن دل ہے بہت، جب سے الگ بیٹھا ہوں

غیر سے دُور، مگر اُس کی نگاہوں کے قریں
محفلِ یار میں اِس ڈھب سے الگ بیٹھا ہوں

یہی مسلک ہے مرا، اور یہی میرا مقام
آج تک خواہشِ منصب سے الگ بیٹھا ہوں

عُمر کرتا ہوں بسر گوشۂ تنہائی میں
جب سے وہ روٹھ گئے، تب سے الگ بیٹھا ہوں

میرا انداز نصیؔر اہلِ جہاں سے ہے جُدا
سب میں شامل ہُوں، مگر سب سے الگ بیٹھا ہوں

◎

سلسلہ ٹوٹے نہ ساقی ہوش اُڑ جانے کے بعد
مجھ کو ملتا ہی رہے پیمانہ، پیمانے کے بعد

کھو دیا دُنیا میں جو کچھ تھا، تجھے پانے کے بعد
جان سے جانا پڑا ہم کو، ترے آنے کے بعد

تُو ہی تھا وہ شمع جس کی روشنی تھی ہر طرف
رنگ محفل میں کہاں اب تیرے اُٹھ جانے کے بعد

جاؤ بیٹھو چین سے میں کیا کہوں، تم کیا سنو
اب پشیمانی سے کیا حاصل، ستم ڈھانے کے بعد

اِس کا کیا کہنا ہے! زاہد کے ٹھکانے ہیں بہت
یہ کسی مسجد میں جا بیٹھے گا، میخانے کے بعد

شمعِ محفل روئے یا ہنس کر گزارے صبح تک
کون اب جلنے یہاں آئے گا پروانے کے بعد

حُسنِ رخ کی اک جھلک نے کر دیئے اوسان گم
ہوش آیا تو مگر اُن کے چلے جانے کے بعد

سچ ہے کوئی بھی شریکِ دردِ و غم ہوتا نہیں
ہو گئے احباب رخصت مجھ کو سمجھانے کے بعد

اب تو کہتے ہو کہ جا! میری نظر سے دُور ہو
تم منانے آؤ گے مجھ کو، مرے جانے کے بعد

طائرِ دل! خال تو دیکھا، خمِ گیسو بھی دیکھ
دام بھی تجھ کو نظر آ جائے گا، دانے کے بعد

وحشتِ دل کی بدولت ہم چلے آئے یہاں
دیکھیے اب کونسی منزل ہے ویرانے کے بعد

کون روتا ہے کسی کی حالتِ بد پر نصیرؔ
زیرِ لب ہنستی ہے دُنیا، میرے لُٹ جانے کے بعد

◎

مطمئن کب حیات ہوتی ہے
دن گُزرتا ہے، رات ہوتی ہے

جب ترے غم کی بات ہوتی ہے
مضطرب کائنات ہوتی ہے

دیکھیے، کس پہ ہو نگاہِ کرم
یہ مقدّر کی بات ہوتی ہے

زندگی پر ہو اعتماد کیسے
زندگی بے ثبات ہوتی ہے

معتبر نامہ بر بھی ہے، لیکن
اپنی بات اپنی بات ہوتی ہے

جو گھڑی اُن کی یاد میں گزرے
حاصلِ صد حیات ہوتی ہے

ہر جگہ، ہر مقام، ہر دل میں
رونقِ حُسنِ ذات ہوتی ہے

لاکھ محفل سجایئے، لیکن
آپ کی اور بات ہوتی ہے

تخلیہ ہو، تو اُن کے جلووں کی
اچھّی خاصی برات ہوتی ہے

پھر بنالیں گے آشیاں، صیّاد!
چار تنکوں کی بات ہوتی ہے

دیکھیے اب نصیرؔ پر کس دن
نگہِ التفات ہوتی ہے

◎

بات اِک سُنتے ، تو سَو مُجھ کو سُناتے جاتے
رُوٹھ جانے سے تو بہتر تھا کہ آتے جاتے

کر دیا قتل تو میّت بھی اُٹھاتے جاتے
میری مٹّی تو ٹھکانے وہ لگاتے جاتے

وہ سرِ شام جُدا ہو گئے غم اِس کا ہے
خیر سے رات گئے نیند کے ماتے ، جاتے

نہ سہی لُطف ، تو بیدادِ تبسّم ہی سہی
اور دیوانے کو دیوانہ بناتے جاتے

وعدۂ وصل بھی اِک حرفِ تسلّی نکلا
میرا دل رکھنے کو "ہاں" کہہ گئے جاتے جاتے

خود تو آسودۂ افلاک ہیں تارے کیا کیا
چین کی نیند مجھے بھی تو سُلاتے جاتے

جان قربان کروں اُس رُخِ زیبا پہ نصیرؔ
اِک جھلک مجھ کو نظر آئے جو آتے جاتے

◎

نہ وہ اہتمام مئے کُہن ، نہ وہ میکدے کا نظام ہے
نہ وہ رند ہیں ، نہ وہ ہاو ہُو ، نہ وہ دَور ہے ، نہ وہ جام ہے

وہ ہے خوش نصیب جسے ملے ، مئے معرفت کا یہ جام ہے
نہ وہ خود پلائیں حلال ہے ، نہ پلائیں وہ ، تو حرام ہے

ذرا دیکھ اپنے مریض کو کہ ہر اُس کی سانس میں آج بھی
ترے انتظار کی ہے کسک ، تری یاد ہے ، ترا نام ہے

کہوں کس سے قصّۂ شوق میں ، نہ وہ ہمنوا ، نہ وہ ہمزباں
نہ وہ ہمسفر ، نہ وہ کارواں ، نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے

چلی ایسی بادِ خزاں اثر ، کہ ہُوں دامِ غم میں شکستہ پَر
نہ بُتوں کی دل میں ہے آرزو ، نہ وہ شوقِ جلوۂ بام ہے

وہ نیاز و ناز کی محفلیں ، نہ وہ چاند ہے نہ وہ چاندنی
نہ وہ رات ہے ، نہ وہ بات ہے ، نہ وہ حُسنِ ماہِ تمام ہے

نہ فراقِ یار کے مشغلے، نہ وہ بزمِ شوق کے ولولے
نہ وہ سوزِ سینہ گُداز ہے، نہ وہ آہِ برق خرام ہے

یہ عجیب دَور ہے رُونما کہ اَدب کا پاس نہیں رہا
نہ وہ اہلِ درد کی حُرمتیں، نہ وہ احترامِ مقام ہے

کہوں مَیں بھلا، وہ بُرا کہیں، کروں مَیں وفا، وہ جفا کریں
اُنہیں اپنے کام سے ہے غرض، مجھے اپنے کام سے کام ہے

وہ ہزار کوئی جتن کرے، تری دسترس سے نہ بچ سکے
تری زُلف حلقہ بدوش ہے، تری آنکھ بادہ بہ جام ہے

ترے سنگِ در پہ جو ہو ادا، وہی ایک سجدہ ہے کام کا
یہی اِک نماز ہے عشق کی جو بغیرِ شرطِ امام ہے

مَیں نصیؔر فقر سرشت ہُوں، کہ مریدِ ساقیِ چشت ہُوں
مجھے بادشاہوں سے کام کیا، اُنہیں دُور ہی سے سلام ہے

◎

بخشیں، نہ گواہ چاہتا ہوں — مجرم ہوں، پناہ چاہتا ہوں
جب ختم ہو میرے سانس کی رَو — تم کو سرِ راہ چاہتا ہوں
نظارۂ مہ وَشاں سے پہلے — تطہیرِ نگاہ چاہتا ہوں
اوروں کے کرم مجھے گوارا — اپنوں سے پناہ چاہتا ہوں
تکمیلِ وفا پہ ضد سے حاصل؟ — کیوں خُود کو تباہ چاہتا ہوں
اِک تم، کہ چُھڑا رہے ہو دامن — اِک مَیں، کہ نباہ چاہتا ہوں
ہیں نقشِ قدم جہاں تمہارے — تاروں میں وہ راہ چاہتا ہوں
جو صرف مرے لئے اُٹھی ہو — وہ ایک نگاہ چاہتا ہوں
تُو نے مجھے آج تک نہ چاہا — پھر بھی تجھے آہ! چاہتا ہوں
جس پر ترے قُرب کا ہو آنچل — وہ شامِ سیاہ چاہتا ہوں
تم مجھ سے نباہ کیا کرو گے — مَیں تم سے نباہ چاہتا ہوں
ہو جس پہ نظر قلندروں کی — سَر پر وہ کلاہ چاہتا ہوں
اب سلسلۂ کرم نہ ٹُوٹے — بس ربطِ نگاہ چاہتا ہوں

اور اُن سے نصیؔر کیا کہوں مَیں
دامن میں پناہ چاہتا ہوں

◎

غمِ ہجراں کی ترے پاس دوا ہے کہ نہیں
جاں بلب ہے ترا بیمار، سنا ہے کہ نہیں

وہ جو آیا تھا، تو دل لے کے گیا ہے کہ نہیں
جھانک لے سینے میں کم بخت ذرا، ہے کہ نہیں

مخمصے میں تری آہٹ نے مجھے ڈال دیا
یہ مرے دل کے دھڑکنے کی صدا ہے کہ نہیں

سامنے آنا، گزر جانا، تغافل کرنا
کیا یہ دنیا میں قیامت کی سزا ہے کہ نہیں

اہلِ دل نے اُسے ڈھونڈا، اُسے محسوس کیا
سوچتے ہی رہے کچھ لوگ، خدا ہے، کہ نہیں

تم تو ناحق مری باتوں کا بُرا مان گئے
مَیں نے جو کچھ بھی کہا تم سے، بجا ہے کہ نہیں؟

آبرو جائے نہ اشکوں کی رَوانی سے نصیرؔ
سوچتا ہوں، یہ محبّت میں روا ہے کہ نہیں

◎

اَب تو بچائے مجھ کو خُدا ہی — اُن کا تبسّم، میری تباہی
حُسن کے جلوے، عشق کے چرچے — میری وفا کی دیں گے گواہی
جلوۂ رُخ ہے پرتوِ رحمت — سایۂ گیسو ظِلِّ الٰہی
راہِ وفا میں کون کسی کا — عشق ہی منزل، عشق ہی راہی
مجھ کو سنبھالیں آپ خُدارا — چاہے سمجھ لیں مجھ کو بُرا ہی
دل کی لگی پھر شُعلہ فگن ہے — آنچ نہ آئے اُن پہ، الٰہی!
چھوڑ کر اُن کے شہر کی گلیاں — کون پھرے اب واہی تباہی

مَیں ہوں نصیرؔ اب اُن کا گداگر
بیٹھے بٹھائے مل گئی شاہی

◎

آج اک اک بادہ کش مسرور میخانے میں ہے

تازہ تازہ اِس کے، اُس کے، سب کے پیمانے میں ہے

شیخ جل اُٹھے گا تُو! وہ شُعلہ میخانے میں ہے

مے نہیں یہ، اک دہکتی آگ پیمانے میں ہے

اپنا دیوانہ بنا لیتا ہے ساری خلق کو

اک ادائے خاص ایسی اُن کے دیوانے میں ہے

دیر بوتل کے اُٹھانے میں لگے گی کچھ نہ کچھ

مجھ کو اُتنی ہی بہت ہے جتنی پیمانے میں ہے

میکدے میں آنے والو! میکدہ مت چھوڑنا

مرنے جینے کا مزا کچھ ہے، تو میخانے میں ہے

پی رہا ہُوں، جی رہا ہُوں، شاد ہُوں، مسرور ہُوں

زندگی ہی زندگی لبریز پیمانے میں ہے

دل کی بے کیفی کا یہ عالم ہُوا بعدِ جُنوں

لُطف جینے کا نہ گُلشن میں، نہ ویرانے میں ہے

دھیان ہے آہٹ پہ، حسرت دل میں ہے، آنکھوں میں دم

ہم چلے دنیا سے، اُن کو دیر آنے میں ہے

جاگ اُٹھی قسمت، مقدر جگمگا اُٹھا نصیر

جلوہ فرما آج کوئی میرے کاشانے میں ہے

چھوڑ دو گے تم ہمیں دشمن کے بہکانے سے کیا
یوں تمہیں مل جائے گا، اپنوں کو تڑپانے سے کیا

لاکھ سمجھاؤ مگر ہوتا ہے سمجھانے سے کیا
ہوش کی باتیں کرو، اُلجھو گے دیوانے سے کیا؟

آپ کی باتیں سُنیں واعظ! مگر مانیں نہیں
چوٹ کھاتا، آپ جیسے جانے پہچانے سے کیا؟

رقص کے عالَم میں ہو جیسے یہ سارا میکدہ
آنکھ ساقی نے ملا رکھی ہے پیمانے سے کیا؟

خیر، ہم نے مان لی جو بات بھی تم نے کہی
تم کہو، تم کو ملا جھوٹی قسم کھانے سے کیا؟

سامنے جب آگئے کیسی حیا، کیسا حجاب
فائدہ اب مُنہ چھپانے اور شرمانے سے کیا

دیکھ زاہد! بادۂ سرجوش کے چھینٹے نہ ہوں
تیرے دامن پر ہیں یہ تسبیح کے "دانے سے" کیا

ترکِ اُلفت، اور پھر اُلفت بھی اُس بے مثل کی
مَیں بہک جاؤں گا واعظ! تیرے بہکانے سے کیا؟

آگ میں اپنی جلا کر خاک کر ڈالا اُسے
شمع! آخر دشمنی ایسی بھی پروانے سے کیا

چارہ سازو! کیوں دوا کرتے ہو، مَر جانے بھی دو
بزم ہو جائے گی سُونی میرے اُٹھ جانے سے کیا؟

مَے کشی لازم نہیں ہے بزمِ ساقی میں نصیرؔ
کام جب آنکھوں سے چل جائے تو پیمانے سے کیا

◎

کچھ ایسا محال تو نہیں ہے   دیدار، وصال تو نہیں ہے

دل لے کے بدل گئے نگاہیں   یہ مفت کا مال تو نہیں ہے

بے وجہ وہ مہرباں ہے کیوں کر   دیکھو! کوئی چال تو نہیں ہے

شکوہ کروں بے وفائیوں کا   میری یہ مجال تو نہیں ہے

فرقت کا جواب، ہمنشینی   عزّت کا سوال تو نہیں ہے

ہر بات کو کل پہ ٹالتے ہو   وعدہ ہے، وبال تو نہیں ہے

کیوں کرتے ہو خونِ آرزو کا   تم پر یہ حلال تو نہیں ہے

اِس درجہ نہ ہو ستم پہ نازاں   یہ کوئی کمال تو نہیں ہے

دیکھو تو نصیرؔ دل کی جانب
گُدڑی میں یہ لال تو نہیں ہے

◎

یہ مانا بے زباں ہوتے ہیں کانٹے   مگر آزارِ جاں ہوتے ہیں کانٹے

گلوں سے راہ و رسم اچھی نہیں ہے   رگِ گُل میں نہاں ہوتے ہیں کانٹے

محبّت کی عجب اٹھکیلیاں ہیں   دِلوں کے درمیاں ہوتے ہیں کانٹے

سنبھلنا، اے چمن کے رہنے والو!   شریکِ آشیاں ہوتے ہیں کانٹے

بیاں کوئی کرے کیا اِن کی فطرت   خود اپنی داستاں ہوتے ہیں کانٹے

وہ صحرا تھا، خلش کوئی نہیں تھی   یہ گُلشن ہے، یہاں ہوتے ہیں کانٹے

چلے تھے جو گلوں سے عشق کرنے   اُنھیں اب کیوں گراں ہوتے ہیں کانٹے

مرا دامن ہے یہ، جھٹکو اِسے تم   یہیں پل کر جواں ہوتے ہیں کانٹے

چبھن کچھ اور بڑھ جاتی ہے اِن کی   کہاں نذرِ خزاں ہوتے ہیں کانٹے

سکوں پائیں نصیرؔ اہلِ چمن کیا
جہاں جائیں، وہاں ہوتے ہیں کانٹے

◎

سمجھ میں آئی ، پر برسوں رہے دھوکے میں ہم پہلے
اَدب گاہِ حرم سے بُتکدہ تھا دو قدم پہلے

غضب ہے یُوں ترا پلکیں جھپکتے ہی بدل جانا
سِتم ہونے لگا اُن پر کہ تھا جن پر کرم پہلے

حیا کہیے کہ ضد ، دونوں طرف سے ٹھن گئی ایسی
قدم اپنا اٹھائیں گے نہ وہ پہلے ، نہ ہم پہلے

ہمارا کیا ہے ، تیرے ساتھ تھوڑی ہم بھی پی لیں گے
خدا کا نام لے کر جام اُٹھا شیخِ حرم ! پہلے

ترے آنے سے پہلے ہی بچھاتے راہ میں آنکھیں
خبر آمد کی دینا چاہیئے تھی کم سے کم پہلے

بقا کی جُستجو ہے تو فنا کر اپنی ہستی کو
کہ ہست و بودِ عالم سے ہے دنیائے عدم پہلے

مری تقدیر کے بل کا نکلنا بعد میں ہو گا
ذرا سیدھے تو ہو لیں یہ تری زُلفوں کے خَم پہلے

جدائی کے تصوّر سے بھر آئے اشک آنکھوں میں
چلے جانا ، ٹھہرنے دو ذرا سیلابِ غم پہلے

جنابِ شیخ کی درپردہ رِندی کا بھی کیا کہنا
پہنچ جاتے ہیں اکثر میکدے میں محترم پہلے

چلے ہیں کوئے جاناں کی طرف ہم بھی پسِ قاصد
نصیؔر اب دیکھتے ہیں ، وہ پہنچتا ہے کہ ہم پہلے

◎

دن سہانے تلاش کرتے ہو
گم خزانے تلاش کرتے ہو

خود مٹائے ہمارے قلب و جگر
اب ٹھکانے تلاش کرتے ہو

عشق برحق، وفا حقیقت ہے
تم فسانے تلاش کرتے ہو

وہ پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے
جو زمانے، تلاش کرتے ہو

یہ قفس ہے، چمن نہیں یارو!
آشیانے تلاش کرتے ہو

میرے قلب و جگر کی خیر نہیں
تم نشانے تلاش کرتے ہو

اُس کو ڈھونڈو یہیں کہیں دل میں
بے ٹھکانے، تلاش کرتے ہو

اُن کے کُوچے کی خاک ہے اکسیر
کیوں خزانے تلاش کرتے ہو

مست آنکھوں سے کیوں نہیں پیتے
بادہ خانے تلاش کرتے ہو

صاف کہہ دو اگر نہیں ملنا
کیوں بہانے تلاش کرتے ہو

سب نئے رنگ ڈھونڈتے ہیں نصیر
تم پُرانے تلاش کرتے ہو

◎

پیمانِ وفا اور ہے سامانِ جفا اور
اُس فتنۂ دَوراں نے کہا اور، کیا اور

تیور الگ، انداز جدا، اُن کی ادا اور
وہ اور ہَوا میں ہیں، زمانے کی ہَوا اور

ترکیب کوئی اُن کو منانے کی ہو کیا اور
مَیں جتنا مناتا ہوں، وہ ہوتے ہیں خفا اور

پی لیں جو کبھی شیخ تو پی پی کے پکاریں
اے ساقیِ میخانہ! ذرا اور، ذرا اور

محروم ہُوا دِین سے، دنیا کی طلب میں
نا فہم نے کچھ اور ہی سوچا تھا، ہُوا اور

پھولوں کی وہاں دُھوپ، یہاں سایۂ وحشت
گلشن کی فضا اور ہے، صحرا کی فضا اور

انصاف ملے گا سرِ میدانِ قیامت
اُن کا نہ خدا اور ، نہ میرا ہی خدا اور

دیکھیں تو ذرا ہم بھی اُسے، اے ہمہ خُوبی!
ہم جیسا وفادار کوئی ڈھونڈ کے لا! اور

چھوڑیں نہ محبت کو نصیر اہلِ محبت
یہ شوق خطا ہے ، تو خطا اور خطا اور

◎

نہ آئے تجھ کو نظر ، تُو مگر اُداس نہ ہو
تلاش کر ، وہ یہیں تیرے آس پاس نہ ہو

مجھے یقین نہیں ، اُس کو تیرا پاس نہ ہو
ترا گمان نہ ہو ، یہ ترا قیاس نہ ہو

وہ اور کیا کرے آخر ، اگر اُداس نہ ہو
بغیرِ عشق نہ چین آئے ، عشق راس نہ ہو

یہ کس کو لوگ لیے جارہے ہیں کاندھوں پر
کہیں یہ شخص تمہارا وفا شناس نہ ہو

بچھڑنے والوں کو پھر بھی خدا ملاتا ہے
تمہیں ہماری قسم ، اِس قدر اُداس نہ ہو

یہ بندگی ہے، کہ ہر حال میں ہو شُکر اُس کا
ہزار کچھ ہو ، مگر کوئی ناسپاس نہ ہو

وہ ماجرا جو ہے مجنوں کے نام سے مشہور
کہیں ہمارے فسانے کا اقتباس نہ ہو

ضیائے علم و ہُنر سے ہے آبروئے بشر
یہ روشنی تو ہو ، اُجلا اگر لباس نہ ہو

مزا تو جب ہے کہ ہو بات بات قند و نبات
وہ بات زہر ہے جس بات میں مٹھاس نہ ہو

ہے ایک طنز کا نشتر ، دُعائے عُمرِ دراز
اُس ایک شخص کو، جینے کی جس کو آس نہ ہو

نصیرؔ کھیل نہیں ہے شعورِ ذات و صفات
خدا شناس کہاں وہ ، جو خودشناس نہ ہو

◎

نہیں پرواز کی طاقت ، غنیمت ہیں مگر پھر بھی
ہمارے کام آتے ہیں ہمارے بال و پر پھر بھی

کیا وعدہ مگر آیا نہیں وہ رات بھر پھر بھی
اُسی کی رہ گزر تکتے رہے ہم تا سحر پھر بھی

پئے تسکینِ خاطر لاکھ حیلے ہوں ، وسیلے ہوں
نہیں ہوتا سُکونِ دل میسّر ، عمر بھر پھر بھی

جو اُن کے دل میں ہے نوکِ زباں پر وہ نہیں لاتے
بُہت کچھ کہہ رہا ہے اُن کا اندازِ نظر پھر بھی

یہ مانا خط میں سب کچھ لکھ دیا تفصیل سے ہم نے
زبانی کچھ ہمارا حال کہنا نامہ بَر! پھر بھی

حسینانِ جہاں سفّاک بھی ہیں ، سنگ دل بھی ہیں
نہ ہو ڈرنے کی کوئی بات ، لیکن اِن سے ڈر پھر بھی

وطن سے دُور آسائش کسی کو مل نہیں سکتی
خُدا لگتی تو یہ ہے، اپنا گھر ہے اپنا گھر پھر بھی

پیے جاتا ہوں، لیکن تشنگی تا حال باقی ہے
ترے قربان ساقی! اک ذرا زحمت اِدھر پھر بھی

لُٹا بیٹھے ہزاروں قافلے منزل کی راہوں میں
نہ باز آئے جُنونِ رہبری سے راہبر پھر بھی

وہ اک تم ہو کہ تم نے عہد و پیماں توڑ ڈالے ہیں
یہ اِک ہم ہیں، اَڑے بیٹھے ہیں اپنی بات پر پھر بھی

شبِ غم چاند چُھپ جائے گا، تارے ڈُوب جائیں گے
نہ ہوگی رُونما میری اُمیدوں کی سحر پھر بھی

ہمارا کام ہے اچھی بُری ہر بات سمجھانا
یہ اُن کا اپنا ذمّہ ہے نہ سمجھیں وہ اگر پھر بھی

ہمیں پر منحصر کیا ہے ہم اُٹھتے ہیں تو اُٹھ جائیں
رہے گا سجدہ گاہِ شوق اُن کا سنگِ در پھر بھی

بہ اندازِ مسیحائی وہ اپنا ہاتھ رکھتے ہیں
نہیں معلوم، کیوں تھمتا نہیں دردِ جگر پھر بھی

یقیں آہی گیا آخر اُنہیں دُشمن کی باتوں کا
بہت کچھ ہم نے سمجھایا، نہ سمجھے وہ مگر پھر بھی

علاجِ زخمِ دل ممکن نہیں اِن کم نگاہوں سے
نصیر اُلجھے ہُوئے ہیں اپنی ضد میں چارہ گر پھر بھی

◎

بَل ڈالئے جبیں پہ نہ خنجر نکال کے
اِتنے جواب، اور مرے اِک سوال کے ؟

قُربان جاؤں آپ کی اِس چال ڈھال کے
آتے ہی چل دیئے مجھے اُلجھن میں ڈال کے

صدقے مَیں اِس کرم کے، تصدق خیال کے
وعدے تو بار بار کئے ہیں وصال کے

پھر بھی مِری وفا کا یقیں تو نہیں کیا
دل رکھ دیا تھا سامنے اُس کے، نکال کے

یہ خار زارِ دشتِ جُنوں ہے ذرا سنبھل
اِس راہ سے گزر بھی تو دامن سنبھال کے

گیسو کے پیچ و خَم میں مرا دل پھنسا رہا
آخر پتہ چلا کہ یہ حلقے ہیں جال کے

کہنے کو ایک بار تو وعدہ وفا کرو
کیوں روز روز بات بڑھاتے ہو ٹال کے

مدّت کے بعد اُن پہ عَدو کا بھرم کُھلا
نادم ہیں آستیں میں وہ سانپ پال کے

میرے یہ شعر، آب میں موتی سے کم نہیں
ہاتھ آئے، فن کے سات سمندر کھنگال کے

اَللہ ! دَم کی خیر ، کہ یہ کُوئے یار ہے
رکھنا قدم نصیؔر ذرا دیکھ بھال کے

◎

حیران ہزاروں ہیں، پریشان ہزاروں
پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے انسان ہزاروں

مجنوں ہی پہ کیا، لُٹ گئے انسان ہزاروں
اک دستِ جنوں میں ہیں گریبان ہزاروں

الزام ترے سر ہیں بہر آن ہزاروں
ہیں زُلفِ پریشاں سے پریشان ہزاروں

اِیفا کبھی ہو جائیں تو تقدیر ہماری
باندھے تو ہیں اُس شوخ نے پیمان ہزاروں

ابرو ہیں کہ محرابِ حرم قبلۂ عُشّاق
آنکھوں پہ لُٹا بیٹھے ہیں ایمان ہزاروں

زاہد نے چھلکتا ہُوا ساغر نہیں دیکھا
ہر موج میں پوشیدہ ہیں طوفان ہزاروں

ہو جائے عنایت کی نظر کاش اِدھر بھی
ہم دل میں لیے بیٹھے ہیں ارمان ہزاروں

اک ہم ہیں کہ جیتے ہیں ترے ہجر میں اب تک
کرتے ہیں فدا روز مگر، جان ہزاروں

دُنیائے محبت میں نصیرؔ ایک ہمیں کیا
گھر بار کیے بیٹھے ہیں ویران ہزاروں

◎

آگئیں چل کے ہوائیں ترے دیوانے تک
اب یہی لے کے چلیں گی اُسے میخانے تک

کوئی چھیڑے نہ مجھے عہدِ بہار آنے تک
میں پہنچ جاؤں گا خود جھوم کے میخانے تک

آ کے خود رقص کیا کرتا ہے جل جانے تک
شمعِ سوزاں کبھی جاتی نہیں پروانے تک

آنا جانا تو ہے واعظ ! مرے کاشانے تک
ایک دن آپ چلے آؤ گے میخانے تک

اب نقاہت کا یہ عالم ہے کہ اُٹھتے نہیں ہاتھ
صرف نظریں ہی پہنچ سکتی ہیں پیمانے تک

اِس کڑے وقت میں احباب نہ کام آئیں گے
تشنگی دے گی سہارا مجھے میخانے تک

دھیان زاہد کا خدا تک کسی صورت نہ گیا
دسترس تھی اُسے تسبیح کے ہر دانے تک

تجھ کو بُھولے سے بھی مَیں بُھول سکوں، ناممکن
یہ تعلّق تو رہے گا مرے مَر جانے تک

دل پہ عالم یہ گھٹن کا ، یہ صبا کے غمزے
دیکھیئے کیا ہو، تری زلف کے لہرانے تک

راہ دُشوار نہیں ، سنگ نہیں ، خار نہیں
مُطمئن ہو کے وہ آئیں مرے کاشانے تک

تم تو اپنے تھے، نہ تھی تم سے یہ اُمید ہمیں
کوئی مرتا ہو تو آجاتے ہیں بیگانے تک

آج کل بیخودیِ شوق کا عالم ہے عجیب
کہیں مَیں آپ نہ کھو جاؤں تجھے پانے تک

موت برحق ہے ، مگر آخری خواہش یہ ہے
سانس چلتی رہے میری ، ترے آجانے تک

بات کرنی ہے نکیرین سے تنہا سب کو
ساتھ رہتے ہیں یہ احباب تو دفنانے تک

مَسندِ پیرِ مغاں دُور بہت ہے مجھ سے
ہاتھ اُٹھ کر بھی پہنچتے نہیں پیمانے تک

قدم اُٹھتے نہیں، اب ضعف کا عالم ہے نصیرؔ
کوئی لے جائے مجھے تھام کے میخانے تک

◎

ہر ادا یُوں ہے، سزا ہو جیسے — یہ بھی اک اُن کی ادا ہو جیسے

اُن کا آنا بھی ہَوا ہو جیسے — چور آنگن میں چُھپا ہو جیسے

یُوں ہے پہلو میں دلِ افسردہ — ساز خاموش پڑا ہو جیسے

مجھ کو محفل میں بُلاتا ہی نہیں — تُو مجھے بُھول گیا ہو جیسے

اِس طرح کانپ گیا دل میرا — تم نے کچھ مجھ سے کہا ہو جیسے

عارض ایسے، کہ چمن میں دو پھول — زُلف ایسی، کہ بَلا ہو جیسے

عشق کا بھید چُھپائے نہ چُھپا — میرے ماتھے پہ لکھا ہو جیسے

اِس طرح غم نے پکارا مجھ کو — کسی سائل کی صدا ہو جیسے

میرا دل، اور مجھی سے بیزار — اُن کے پہلو میں رہا ہو جیسے

ہیں خفا لفظِ وفا پر وہ نصیرؔ
بات کرنا بھی خطا ہو جیسے

◎

تُو نے جو بخشے ہمیں اسبابِ غم اچّھے لگے
تیرے بے جا ظلم بھی تیری قسم اچّھے لگے

غم کی دنیا سے ہوئی مانوس یُوں طبعِ حزیں
اپنے غم اچّھے لگے ، دُنیا کے غم اچّھے لگے

اک اِسی کے دم سے تھے اہلِ جنوں میں بے وقار
عقل کھو کر کوچۂ جاناں میں ہم اچّھے لگے

پاس جب آئے تو ہم پر کُھل گیا دامِ فریب
دُور سے کیا کیا تری زلفوں کے خَم اچّھے لگے

ہم بُرا کہتے رہے ، جب تک شناسائی نہ تھی
میکدے میں آئے تو شیخِ حرم اچّھے لگے

روگ دل کے دُھل گئے ، قسمت کے عُقدے کُھل گئے
آپ کی نسبت ہوئی حاصل تو ہم اچّھے لگے

دل اُنہیں دے کر محبّت کا بھرم رکھنا پڑا
بے رُخی اچّھی لگی ، ظلم و ستم اچّھے لگے

اہلِ عالَم سے ہی کیا بے اعتنائی کا گلہ
میرے افسانے نصیرؔ اُن کو بھی کم اچّھے لگے

◎

پھرے ہیں اور پھریں گے نہ حکمِ یار سے ہم
نیازمند ، رہیں گے ہر اعتبار سے ہم

بہت قریب ہیں عکسِ جمالِ یار سے ہم
قدم بڑھائیں اگر حدِ انتظار سے ہم

خزاں سے ہیں نہ پریشاں ، نہ خوش بہار سے ہم
نکل چکے ہیں مناظر کے اب حصار سے ہم

کسی نفَس نہیں آزاد ، خلفشار سے ہم
بلائے دام سے اُلجھے کہ زُلفِ یار سے ہم

الٰہی ! کون سا عالم ہے یہ گلستاں کا
بہار میں بھی ہیں بیگانۂ بہار سے ہم

عذابِ جاں ہیں غلط فہمیاں محبّت میں
نہ اب قرار سے وہ ہیں نہ اب قرار سے ہم

جو پُھوٹتے نہیں صحرا میں پاؤں کے چھالے
تو اُن کو چھیڑتے رہتے ہیں نوکِ خار سے ہم

وہ آگئے تھے تو دل کا عجیب عالَم تھا
خوش اِس قدر تھے ، نظر آئے بے قرار سے ہم

ستم تھا اُن سے اچانک نگاہ کا مِلنا
وہ مُنفعل سے رہے اور شرمسار سے ہم

ہُوا جو آپ کا ارشاد ، ہم بجا لائے
ہیں اعتبار کے لائق ، اِس اعتبار سے ہم

یہ احترامِ تجلّی ، یہ اہتمامِ وفا
نظر بچا کے گزرتے رہے بہار سے ہم

یہی دُعا ہے کہ تم آؤ یا قضا آئے
نجات پائیں محبّت میں جیت ہار سے ہم

ہمیں اُٹھانے کو آئے وہ فتنۂ محشر
نصیرؔ ! یُوں نہ اُٹھیں گے کبھی مزار سے ہم

◎

ہم کسی کا گِلا نہیں کرتے — نہ ملیں ، جو مِلا نہیں کرتے
چند کلیاں شگفتہ قسمت ہیں — سارے غنچے کِھلا نہیں کرتے
جن کو دستِ جُنوں نے چاک کیا — وہ گریباں سِلا نہیں کرتے
آپ محتاط ہوں زمانے میں — ہر کسی سے مِلا نہیں کرتے
جو محبّت میں سنگِ میل بنیں — وہ جگہ سے ہِلا نہیں کرتے
ناز ہے اُن کو بے وفائی پر — ختم یہ سِلسلا نہیں کرتے
رِستے رہتے ہیں بھیگی راتوں میں — زخمِ دل کے سِلا نہیں کرتے

اُن سے بس اِک نصیرؔ شکوہ ہے
ہم سے وہ کیوں مِلا نہیں کرتے

◎

رکھ دو جو اپنے ہاتھوں سے میّت اُتار کے
ذرّے دُعائیں دیں مری خاکِ مزار کے

تیور تو دیکھ ، حُسنِ تبسّم شعار کے
قُربان ہو رہے ہیں تماشے بہار کے

آخر کو بات مان ہی لی تھک کے ، ہار کے
چُپ ہیں وہ ہاتھ زور سے زانو پہ مار کے

کیسے بُھلاؤں ، ساتھ گزارے جو یار کے
دو دن ہی بس نصیب ہُوئے تھے بہار کے

دیکھے ہُوئے ہے رُوپ صبا ، حُسنِ یار کے
گجرے اُتار لے نہ عُروسِ بہار کے

درکار ہے بس ایک اشارہ نگاہ کا
دل کیا ہے ، جان نذر کروں سر سے وار کے

شرمندہ ہو نہ جائے کہیں شامِ میکدہ
نکلیں نہ آپ اِس طرح زُلفیں سنوار کے

اُس گلبدن کے حُسن کی تزئین اَور ہے
سیکھے ابھی بہار ، سلیقے بہار کے

دُھندلا گیا ہے غم سے مرے دل کا آئنہ
تم سے نہ صاف ہوں گے یہ ذرّے غبار کے

بس یوں ہُوا کہ اور بھی بیتاب ہو گئے
آئے تھے تیرے در پہ سوالی قرار کے

پہنچی جو اُن کی سادگیِ حُسن تک نظر
حُوروں نے رکھ دیئے وہیں زیور اُتار کے

سُورج چڑھا بھی، ڈھل بھی گیا، شام ہو گئی
کچھ تو کہو، تم آئے کہاں دن گزار کے

یہ کس کی خاک ، دوشِ ہَوا پر مچل گئی
اُٹھنے لگے فضا میں بگولے غبار کے

ساقی نہ ہو نصیرؔ ! تو ویراں ہے میکدہ
ایسے میں کیا کریں گے یہاں دن گزار کے

◎

لوگ نالاں ہیں جفا سے تیری
حشر برپا ہے اَدا سے تیری

چھیڑ ہے زُلفِ رسا سے تیری
بات بگڑی ہے صبا سے تیری

کوئی جیتا ہو، تجھے اِس سے غرض
کوئی مرتا ہو ، بلا سے تیری

ساقیِ بزم ! پلا ، دیر نہ کر
مِنّتیں کرتے ہیں پیاسے تیری

بات بنتی ہے کرم سے تیرے
کام چلتا ہے عطا سے تیری

ہم نے لُٹتے ہوئے گھر دیکھے ہیں
ایک سادہ سی ادا سے تیری

حوصلہ ہے ابھی غم سہنے کا
ابھی زندہ ہیں دُعا سے تیری

پھر سہی، حشر کے دن کرلیں گے
بات کرنی ہے خدا سے تیری

دُھوم ہے شُعلہ نوائی کی نصیرؔ
لوگ جلتے ہوں، بَلا سے تیری

◎

مرا سوال ہی اُن کا جواب تھا کیا تھا
یہ اک کرشمہ تھا یا انقلاب تھا کیا تھا

تُمھارا حُسن ، تمہارا شباب تھا کیا تھا
فقط خیال تھا یا کوئی خواب تھا کیا تھا

تمام عُمر نہ دیکھی قرار کی صورت
دلِ حزیں مرے حق میں عذاب تھا کیا تھا

کلیم غش تھے، اُنہیں کیا خبر، دمِ دیدار
جمال تھا کہ فریبِ حجاب تھا کیا تھا

تمہارا حُسن جسے لے اُڑی تھی انگڑائی
شعاعِ مہر تھا، موجِ شراب تھا، کیا تھا

تری نگاہ کا اُٹھنا وہ بار بار اِدھر
کرم تھا یا ستم بے حساب تھا کیا تھا

تمام میکدہ سیراب ہو گیا جس سے
وہ چشمِ یار تھی، جامِ شراب تھا کیا تھا

سمجھ میں آ نہ سکا زندگی کا ہنگامہ
خبر نہیں یہ تماشا تھا، خواب تھا کیا تھا

نظر ہے آج تک اِس جُستجو میں کھوئی ہوئی
وہ حُسنِ یار، جو زیرِ نقاب تھا کیا تھا

نصیرؔ پھر نہ میسّر ہُوا زمانے میں
وہ اِک نَفَس جو بنامِ شباب تھا کیا تھا

◎

اللہ اللہ ! پسِ پردۂ در کی صورت
اب نہ پوچھو کہ ہے کیا میری نظر کی صورت

ہر نَفَس ہے مجھے وحشت میں سفر کی صورت
دشت کی بھی وہی صورت ہے جو گھر کی صورت

دیکھنے دی نہ شبِ غم نے سَحَر کی صورت
دیکھتی رہ گئی فریاد ، اثر کی صورت

چاندنی بن کے اُتر آؤ مرے آنگن میں
تم کو اللہ نے بخشی ہے قمر کی صورت

ہم نے جس دن تمھیں دیکھا تھا اچانک سرِ راہ
ہم نے اُس دن سے نہ دیکھی کبھی گھر کی صورت

وہ بُلا لیں مجھے ، یا آپ چلا جاؤں مَیں
میرے مولٰی! کوئی بن جائے اُدھر کی صورت

سر سلامت رہے ، دیوار ہے ، دیوانہ ہے
آپ زنداں میں نکل آئے گی در کی صورت

ایک پامالِ الم ، دوسرا مشغولِ ستم
اک تماشا ہے اِدھر اور اُدھر کی صورت

اک نظر آپ بھی دیکھیں تو ، بہار آئی ہے
دل کا ہر زخم کِھلا ہے گُلِ تر کی صورت

داغ وہ کھائے گا سینے پہ ، مٹائے نہ مٹے
تیری جانب مہِ تاباں نے اگر "کی صورت"

اپنی صورت ہی کو آیئنے میں دیکھا سب نے
دیکھ پایا نہ کوئی آئنہ گر کی صورت

بال اُلجھے ہُوئے ، دل سوختہ ، ویراں آنکھیں
اللہ اللہ ! ترے خاک بسر کی صورت

جن کو اللہ نے بخشے ہوں مقاماتِ بُلند
جب ملے جُھک کے ملے شاخِ شجر کی صورت

جس طرف ہوتا ہے وہ جانِ جہاں محوِ خرام
آنکھیں بچھتی ہیں وہاں راہگزر کی صورت

اُس درِ ناز سے پردہ نہیں اُٹھتا ، نہ اُٹھے
ہم بھی اُٹھنے کے نہیں پردۂ در کی صورت

تا دمِ زیست شکایت رہی آہوں سے نصیرؔ
موت آئی ، تو نظر آئی اثر کی صورت

◎

بُلایا اگر مَیں نے ، آئیں گے کیا؟
مری بات وہ مان جائیں گے کیا؟

ہماری وفائیں بُھلائیں گے کیا
ہمیں کھوئیں گے وہ، تو پائیں گے کیا

نیا کوئی فتنہ اُٹھائیں گے کیا؟
ہمیں آپ پھر آزمائیں گے کیا؟

اُنہیں اور جھگڑوں سے فرصت کہاں
مرے دل میں وہ گھر بنائیں گے کیا

خزاں جن کی قسمت میں لکّھی گئی
گلستاں میں وہ مُسکرائیں گے کیا

تمہیں سے ہمیں کون سا فیض ہے
کسی اور سے دل لگائیں گے کیا

نہیں جن پہ چشمِ کرم آپ کی
وہ میری نظر میں سمائیں گے کیا

نزاکت قدم اُٹھنے دیتی نہیں
مرے گھر بھلا آپ آئیں گے کیا

ہم اُن کی اداؤں پہ خود مَر مِٹے
ستائے ہُوؤں کو ستائیں گے کیا

لُہو خشک، دل خشک، دم خشک ہے
ہم آنکھوں سے آنسو بہائیں گے کیا

نصیرؔ اہلِ دل کا بھرم ہے ابھی
اُنہیں دیکھ کر مَر نہ جائیں گے کیا؟

◎

چار تنکوں کا سہارا کچھ نہیں — صحنِ گُلشن میں ہمارا کچھ نہیں
چین لُوٹا، دل مرا ویراں کیا — بس بگاڑا ہے، سنوارا کچھ نہیں
جان دینے کے لئے حاضر ہیں ہم — عاشقی میں یہ خسارا کچھ نہیں
جُستجو، ایماں، تن آسانی، گناہ — موج سب کچھ ہے، کنارا کچھ نہیں
بے وفائی بھی ترا احسان ہے — اِس سے بڑھ کر حق ہمارا کچھ نہیں
ہم سے دل لے کر یہ ظالم نے کہا — جاؤ، رستہ لو، تمہارا کچھ نہیں
اِک نگاہِ لُطف ہم پر بھی کبھی — عرض ہے اپنی، اِجارا کچھ نہیں

سارے عالم میں وُہی وہ ہیں نصیر
سب کچھ اُن کا ہے، ہمارا کچھ نہیں

◎

راہوں سے تری گُزر رہا ہوں — انگاروں پہ پاؤں دھر رہا ہوں
انجام سے اپنے ڈر رہا ہوں — مجموعۂ خیر و شر، رہا ہوں
صحرا کی ہَوا مجھے گوارا — گلشن کی ہَوا سے ڈر رہا ہوں
احباب مرے بُرا نہ مانیں — مَیں خود سے کلام کر رہا ہوں
ظلماتِ سحابِ زندگی سے — بجلی کی طرح گزر رہا ہوں
مَیں ہوں وہ فریب خُوردہ انساں — سائے سے بھی اپنے ڈر رہا ہوں
الفت ہے اگر گناہ، لوگو! — مَیں بھی یہ گُناہ کر رہا ہوں
آنکھوں سے لُہو بہا بہا کر — محفل میں تری نکھر رہا ہوں
کچھ لوگ مجھے ڈبو چکے تھے — موجوں کی طرح اُبھر رہا ہوں
ہے مدِّ نظر ترا تصوّر — آئینے سے بات کر رہا ہوں
اے دستِ کرم! سمیٹ مجھ کو — ذرّوں کی طرح بکھر رہا ہوں

مَیں بھی ہُوں نصیر کیا تماشا
جو ہو نہ سکے، وہ کر رہا ہوں

◎

وہ کبھی خواب میں آئیں تو سہی　　میری تقدیر جگائیں تو سہی

حالِ دل اپنا سُنائیں تو سہی　　آپ کو ہم کہیں پائیں تو سہی

اُن کی ہر شرط ہے منظور مجھے　　وہ مری راہ پہ آئیں تو سہی

کیا پشیماں ہیں ستم پر اپنے　　آپ کیوں چُپ ہیں، بتائیں تو سہی

آج پر ہی نہیں موقوف کرم　　رُخ بدل جائیں ہوائیں "تو سہی"

لُطف آجائے گا اے واعظِ شہر!　　آپ میخانے میں جائیں تو سہی

کوئی دُشوار نہیں راہِ وفا　　وہ قدم اپنے اُٹھائیں تو سہی

کون کافر ہے جو ہو منکرِ مے　　آپ اک گھونٹ پلائیں تو سہی

کھنچ کے آجائیں گے مے خوار نصیر

میکدہ آپ سجائیں تو سہی

◎

بسے ہیں آپ مرے دل میں عُمر بھر کے لئے

صدف بنا تھا یہ شاید اِسی گُہَر کے لئے

بلا خریدی ہے مَیں نے یہ عُمر بھر کے لئے

تمہاری زُلف کا سودا ہے میرے سر کے لئے

جو بے غرض نہ ہو، جس میں نہ ہو خلوص کوئی

سلام ایسے تعلّق کو عُمر بھر کے لئے

شبِ فراق کی لذّت کہاں نصیب اُنہیں

دُعائیں مانگتے رہتے ہیں جو سحر کے لئے

ہُوا یہی کہ رُکے بزمِ غیر میں جا کر

ارادہ کر کے چلے تھے وہ میرے گھر کے لئے

ہمارے دل کو متاعِ حیات کب سمجھا

نشانہ چاہیے اُس شوخ کو نظر کے لئے

جو داستانِ غم و درد کا خُلاصہ ہو
مجھے وہ اشک ہے درکار، چشمِ تر کے لئے

ہوس کی آنکھ سے اوجھل ہے بندگی کا مقام
علوِّ عجز ہی معراج ہے بشر کے لئے

عدم کو لے کے چلا ہُوں نصیرؔ داغِ فراق
یہ زادِ راہ بہت ہے مجھے سفر کے لئے

◎

آپ میں ظُلم کے انداز اَب آنے تو لگے
خیر سے چاہنے والوں کو ستانے تو لگے

بے حجابانہ سرِ بزم وہ آنے تو لگے
شرم کچھ دُور ہوئی، آنکھ ملانے تو لگے

خود نہ آئیں، وہ مجھے پاس بلانے تو لگے
رفتہ رفتہ ہی سہی، راہ پہ آنے تو لگے

دیکھئے! آپ کے دامن سے نہ ذرّے لپٹیں
دلِ برباد کی خاک آپ اُڑانے تو لگے

میرے کہلائے، مگر اُن کے رہے حضرتِ دل!
اُن کی جاگیر بنے، ہوش ٹھکانے تو لگے!

کچھ نہ کچھ اپنی جفاؤں کا ہے احساس اُنہیں
شکوہ کرنے پہ بہانے وہ بنانے تو لگے

یہ بھی سوچا ہے کہ پھر کس پہ جفائیں ہوں گی
آپ غصّے میں مرے دل کو مٹانے تو لگے

مَے کے چھینٹوں سے ابھی پیاس بُجھے گی زاہد!
جھوم کر ابر سرِ میکدہ چھانے تو لگے

اِس سے بڑھ کر بھی توجّہ کی طلب ہے تجھ کو
چٹکیوں میں وہ تری بات اُڑانے تو لگے

تیرا کُوچہ نہ سہی ، دامنِ صحرا ہی سہی
میری مٹّی کہیں کم بخت ٹھکانے تو لگے

اب نہ کہیئے کہ ملاقات بڑی مشکل ہے
اُن کی محفل میں نصیرؔ آپ بھی جانے تو لگے

◎

ہے آج پھر دلِ دیوانہ زخمہ یابِ جنوں
کسی نے چھیڑ دیا پھر کہیں رَبابِ جنوں

جُنوں کے شہر میں ہے ہم سے آب و تابِ جُنوں
ہمیں نصیب ہے سرمایۂ شبابِ جُنوں

ہماری کِشت جُنوں خیز کیوں نہ ہو آخر
تمام عُمر برستا رہا سحابِ جُنوں

جُنوں پہ خیر! جُنوں لا جواب ہنگامہ
بجز جُنوں نہیں ممکن کوئی جوابِ جُنوں

ابھی نہ چھیڑ مجھے شحنۂ خرد کچھ دیر
پلا رہی ہے کسی کی نظر شرابِ جنوں

جُنوں کی راہ میں چلنا کوئی مذاق نہ تھا
خرد چلی بھی تو دو گام ، ہمرکابِ جنوں

یہ تحفۂ درِ جاناں ہے تُو بھی دیکھ فلک
نشانِ سجدہ جبیں پر ہے آفتابِ جنوں

کتابِ شوق مرتّب ہوئی سلیقے سے
ہمارے نام سے ہے ابتدائے بابِ جنوں

نمازِ عشق ادا کی اِس اہتمام کے ساتھ
بہ فیضِ اشک کیا ہے وضو بہ آبِ جنوں

خرد اُٹھا نہ سکی پھر کوئی بھی ہنگامہ
چڑھی وہ ٹوٹ کے بُوئے شرابِ نابِ جنوں

تمام عُمر کٹی نِت نئے تماشوں میں
نصیرؔ جلوہ بجلوہ رہا خرابِ جنوں

◎

تُو اگر رکھّے گا ساقی ہم سے پیمانہ الگ
ہم بنالیں گے کہیں چھوٹا سا میخانہ الگ

اِس کی آبادی الگ ہے اِس کا ویرانہ الگ
دُور اِس دنیا سے رہتا ہے یہ دیوانہ، الگ

مَے کشی کے ساتھ لطفِ رقصِ پیمانہ الگ
اور اُس پر التفاتِ پیرِ میخانہ الگ

خالِ رُخ، دل کی گرفتاری کا اک سامان ہے
بے خبر! ہوتا نہیں ہے دام سے دانہ الگ

اک مقام ایسا کہ جیتے جی گزر ممکن نہیں
زندگی تج کر بنایا ہم نے کاشانہ الگ

خود نُمائی اُس کی فطرت، بے نیازی اِس کی خُو
رنگِ شاہانہ جدا، شانِ فقیرانہ الگ

گُل کھلائے فصلِ گُل آتے ہی دیوانوں نے یُوں
اب نظر آتا نہیں گلشن سے ویرانہ الگ

آنسوؤں سے لکھ رہے ہیں واقعاتِ زندگی
ہم مرتّب کر رہے ہیں اپنا افسانہ الگ

تیرے صدقے اب نہیں ساقی مجھے کوئی گِلہ
مجھ کو مِل جاتی ہے مَے ، پینے کو روزانہ الگ

خاک پروانے کی ساری شب رہی اُس کے حُضور
شمع سے رہتا نہیں جل کر بھی پروانہ الگ

میکدے میں ہم ہیں ، اپنے ہر نَفَس میں موجِ مَے
اب نہ شیشہ ہے جدا ہم سے ، نہ پیمانہ الگ

زاہدوں کو بادہ نوشوں سے ہو کیوں کر التفات
پارسائی اور شَے ، اندازِ رندانہ الگ

پی رہا ہُوں ، جی رہا ہُوں ، شاد ہُوں ، سرشار ہُوں
دل لگی مَے سے الگ ، ساقی سے یارانہ الگ

میکدے میں اب بھی اِتنی ساکھ ہے اپنی نصیرؔ !
اک ہمارے نام کا رہتا ہے پیمانہ "الگ"

◎

گھر سے نکل کے سیرِ چمن کو چلا تو ہے
آئے گا وہ ہماری طرف بھی ، سُنا تو ہے

رسمِ کرم نہ ہو جو نہیں ہے ، جفا تو ہے
قائم کسی حَسیں سے کوئی سلسلا تو ہے

اِس بے کسی میں ہم کو یہ اک آسرا تو ہے
موجود نامہ بر نہ ہو ، بادِ صبا تو ہے

تیری نظر میں چاہنے والا بُرا تو ہے
لیکن خطا معاف ! تجھے چاہتا تو ہے

ہم نے اُنہیں سُنا تو دیا ، دل کا ماجرا
اب دیکھیے جواب وہ کیا دیں ، کہا تو ہے

میری تباہیوں پہ وہ ظالم لرز اُٹھا
سنگِ گراں کچھ اپنی جگہ سے ہلا تو ہے

طوفانِ غم میں موجِ بلا سے نہ ہو اُداس
ساحل ملے ، ملے نہ ملے ، آسرا تو ہے

اُس بارگاہِ ناز میں پہنچے تو جانیئے
قاصد ہَوا سے تیز اُدھر کو گیا تو ہے

کوئی تو ہے رفیق ، غمِ ہجر میں ضرور
مَیں مانتا ہوں تم جو نہیں ہو ، قضا تو ہے

کہتے ہیں ، یہ خبر تو نہیں ہے ، وہ کون تھا
ہاں ایک شخص شمع کی صورت جَلا تو ہے

تم سے رہا تعلّقِ خاطر کا آسرا
اچھا جو تم مرے نہیں ہوتے ، خدا تو ہے

کیا فائدہ ہے روز کی جھک جھک سے ناصحو !
"مَیں اِس چلن سے ہٹ نہیں سکتا" کہا تو ہے

مِٹ کر بھی صبح و شام تری رہ گزر میں ہُوں
آخر مرا غبار ٹھکانے لگا تو ہے

دنیا کے اِتہام پہ مت جایئے حُضور !
جیسا بھی ہے نصیرؔ، مگر آپ کا تو ہے

◎

بے رُخی اُن کی ہر ادا میں ہے — دل خدا جانے کس ہَوا میں ہے

اک جھلک اُس کی ابتدا میں ہے — آزمائش جو انتہا میں ہے

زُہد میں ہے نہ اِتّقا میں ہے — زندگی معتبر ، وفا میں ہے

قصّے اوروں کے سُن رہا ہے کوئی — داستاں میری التوا میں ہے

خیر یارب ! مرے نشیمن کی — برق بے تاب پھر گھٹا میں ہے

زُلف کی چیرہ دستیاں ، توبہ — آدمی پنجۂ بلا میں ہے

جس طرف چاہے اُس کا رُخ پھیرے — ناؤ اب دستِ ناخدا میں ہے

وہ غرورِ جمال میں گُم ہیں — مدّعی ، عرضِ مدّعا میں ہے

راس آیا نہ جامۂ ہستی — آدمی تنگ سی قبا میں ہے

اور کچھ ہو نصیرؔ میں کہ نہ ہو
سیر چشمی ترے گدا میں ہے

حُسن کی بارگاہ میں رکھیے
دل کو اُن کی نگاہ میں رکھیے

حوصلہ اُن کی چاہ میں رکھیے
وضعداری نباہ میں رکھیے

اُن کے کوچے کی خاک ہے اکسیر
چومیے، پھر کُلاہ میں رکھیے

جو ہمیشہ رہیں شریکِ سفر
ساتھ ایسوں کو راہ میں رکھیے

چھوڑیے بھی مہ و نجوم کی بات
اُن کا چہرہ نگاہ میں رکھیے

مر ہی جائیں جو ہم کو مرنا ہے
کیوں اُنہیں اشتباہ میں رکھیے

ہجر کی تیرگی سے باز آیا
اِس کو زُلفِ سیاہ میں رکھیے

جو خُدا کی پناہ میں ہیں نصیرؔ
خود کو اُن کی پناہ میں رکھیے

صبح سے ہے غرض، نہ شام سے کام
زندگی کو ہے اپنے کام سے کام

ہم کو ہے مے کے اہتمام سے کام
خُوب چلتا ہے دُھوم دھام سے کام

اے مذاقِ طلب! اُدھر لے چل
آپڑا اُن کے لطفِ عام سے کام

آپ لائیں مرے خلاف ثبوت!
چل سکے گا نہ اِتّہام سے کام

وہ کہیں بھی ہمیں نظر آئیں
ہم کو ہے اُن کے احترام سے کام

ہم نے پوچھا تو ہنس کے فرمایا
آپ کو کیا ہمارے نام سے کام

بات کرنے پہ وہ بگڑتا تھا
بن گیا نامہ و پیام سے کام

جاگ اُٹھی نصیرؔ کی قسمت
آپ کو، اور اِس غلام سے کام؟

◎

عشق نے جکڑا ہے مجھ کو اُس کڑی زنجیر سے
جس کے حلقے کُھل نہیں سکتے کسی تدبیر سے

اور ہی کچھ ہو شبِ فرقت کے کٹنے کی سبیل
دل تصوّر سے بہلتا ہے ، نہ اب تصویر سے

خط اِسے مت کہہ ، یہ لکھا ہے مری تقدیر کا
ربط ہے دل کو تمہاری شوخیِ تحریر سے

زندگی بھر اک سہانا خواب ہم دیکھا کیے
تیری صورت مل گئی اُس خواب کی تعبیر سے

اُس نگاہِ ناز پر صدقے دل و جاں ہو گئے
آپ نے دیکھا ؟ نشانے دو اُڑے ، اک تیر سے

اب تو بس دو ہچکیوں کی بات باقی رہ گئی
آپ نے پوچھا مجھے ، لیکن بڑی تاخیر سے

دل کی تنہائی کے سناٹے میں تنہا تھا نصیر
وہ تو کھو جاتا ، مگر تم مِل گئے تقدیر سے

◎

اُن کے اندازِ کرم ، اُن پہ وہ آنا دل کا
ہائے وہ وقت ، وہ باتیں ، وہ زمانا دل کا

نہ سُنا اُس نے توجہ سے فسانا دل کا
زندگی گزری ، مگر درد نہ جانا دل کا

کچھ نئی بات نہیں حُسن پہ آنا دل کا
مشغلہ ہے یہ نہایت ہی پرانا دل کا

وہ محبت کی شروعات ، وہ بے تھاہ خوشی
دیکھ کر اُن کو وہ پُھولے نہ سمانا دل کا

دل لگی ، دل کی لگی بن کے مٹا دیتی ہے
روگ دُشمن کو بھی یارب ! نہ لگانا دل کا

ایک تو میرے مقدر کو بگاڑا اِس نے
اور پھر اُس پہ غضب ہنس کے بنانا دل کا

میرے پہلو میں نہیں آپ کی مُٹھی میں نہیں
بے ٹھکانے ہے بہت دن سے ، ٹھکانا دل کا

وہ بھی اپنے نہ ہُوئے ، دل بھی گیا ہاتھوں سے
"ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا دل کا"

خوب ہیں آپ بہت خوب ، مگر یاد رہے
زیب دیتا نہیں ایسوں کو ستانا دل کا

بے جھجک آ کے مِلو ، ہنس کے مِلاؤ آنکھیں
آؤ ہم تم کو سکھاتے ہیں مِلانا دل کا

نقش بر آب نہیں ، وہم نہیں ، خواب نہیں
آپ کیوں کھیل سمجھتے ہیں مٹانا دل کا

حسرتیں خاک ہُوئیں ، مٹ گئے ارماں سارے
لُٹ گیا کُوچۂ جاناں میں خزانا دل کا

لے چلا ہے مرے پہلو سے بصد شوق کوئی
اب تو ممکن ہی نہیں لَوٹ کے آنا دل کا

اُن کی محفل میں نصیرؔ اُن کے تبسّم کی قسم
دیکھتے رہ گئے ہم ، ہاتھ سے جانا دل کا

◎

ترا خیال رہے ، تیری آرزو بھی رہے
یہ دل ترا ہے کبھی اِس میں آ کے تُو بھی رہے

وُفورِ شوق میں چاہت کی آبرو بھی رہے
تلاشِ یار بھی ہو ، اپنی جستجو بھی رہے

یہ دو گھڑی کی رفاقت نہیں ، محبّت ہے
حیا تو حُسن کا زیور ہے ، گُفتگو بھی رہے

جمالِ حق مری آنکھوں کا نُور بن کے رہا
اگرچہ میری نگاہوں میں خُوبرو بھی رہے

ترے بغیر کبھی مَے کا نام تک نہ لیا
ہزار جام چلے ، سامنے سَبو بھی رہے

خُدا کرے کہ تجھے بھی غمِ محبّت ہو
تمام عُمر گرفتارِ عشق ، تُو بھی رہے

مجھے یہ دُھن ہے کہ محفل میں کوئی غیر نہ ہو
اُسے یہ ضد ہے کہ مَیں بھی رہوں، عَدو بھی رہے
سُنا ہے اُن کی ملاقات کو گئے تھے نصیرؔ
ملے وہ آپ سے، آپ اُن کے رُوبرو بھی رہے

◎

نظر میں بھی نہیں اب گھومتا پیمانہ برسوں سے
قسم کھانے کو بھی دیکھا نہیں میخانہ برسوں سے

نہ پینے کو ملی اک گھونٹ، بے باکانہ برسوں سے
نہیں اب کارفرما جرأتِ رندانہ برسوں سے

سرِ صحرا جدھر دیکھو اُداسی ہی اُداسی ہے
اِدھر آیا نہیں شاید کوئی دیوانہ برسوں سے

کبھی خَلوت، کبھی جلوت، کبھی ہنسنا، کبھی رونا
مرتّب کر رہے ہیں ہم بھی اک افسانہ برسوں سے

یہ تکلیفِ قدم بوسی، یہ اندازِ پزیرائی
ہمارا منتظر تھا غالبًا ویرانہ برسوں سے

میسّر آئی کیا ہم کو گدائی آپ کے دَر کی
گزرتی ہے ہماری زندگی شاہانہ برسوں سے

وہ اپنی ذات کے صحرا میں شاید تیرا جویا ہے
نظر آیا نہیں احباب کو دیوانہ برسوں سے

نصیرؔ اب اپنی آنکھیں اُٹھ نہیں سکتیں کسی جانب
مرے پیشِ نظر ہے اک تجلّی خانہ برسوں سے

◎

یہ کیا کہہ گئے مجھ کو کیا کہتے کہتے — بھلا کہہ گئے وہ بُرا کہتے کہتے

کہیں یہ نہ ہو آنکھ بھر آئے قاصد — مری داستانِ وفا کہتے کہتے

اُٹھا تھا میں کچھ اُن سے کہنے کو، لیکن — زباں رک گئی بار ہا "کہتے کہتے"

وہ سُنتے مگر اے ہجومِ تمنّا ! — ہمیں کھو گئے مدّعا کہتے کہتے

زمانے کی آغوش میں جا پڑے ہم — زمانے کو نا آشنا کہتے کہتے

پلائے گا ساقی تو پینی پڑے گی — کسی دن روا، ناروا کہتے کہتے

نگاہیں جُھکیں، لب ہلے، مُسکرائے — وہ چُپ ہو گئے جانے کیا کہتے کہتے

ادھوری رہی داستانِ محبت — جہاں سے کوئی اُٹھ گیا "کہتے کہتے"

نصیرؔ ایسے اشعار اُن کو سناؤ
وہ شرمائیں بھی مرحبا کہتے کہتے

◎

ہنس دیئے چمن میں گُل، کس لئے خدا جانے
کیا کہا بہاروں نے ، بات یہ صبا جانے

وہ ہمیں الگ سمجھے ، وہ ہمیں جُدا جانے
ہم جنہیں زمانے میں ، اپنا آشنا جانے

اِک چُھپی ہوئی شے کی، اصل کوئی کیا جانے
دردِ دل کا قصّہ ہے ، کون دُوسرا جانے

ہم تو آپ پر صدقے ، آپ ہم سے بیگانہ
ابتدا میں یہ عالم ، انتہا خدا جانے

مَیں تو ہوش کھو بیٹھا ، دیکھ کر دَمِ زینت
آئنے پہ کیا گزری ، اِس کو آئنا جانے

اُس نگاہ پر ہم کو ، اعتبارِ مرہم ہے
جو خلش بڑھا رکھے ، زخم ہی لگا جانے

ہم نے اُن سے جب پُوچھا، کیا ہُوا ہمارا دل
ہنس کے چپ رہے پہلے، پھر کہا، خدا جانے

تیرے در کے ٹکڑوں نے ، جس گدا کو پالا ہو
وہ کسی کو کیا سمجھے ، وہ کسی کو کیا جانے

آپ کیوں ہُوئے مضطر، آپ کیوں پریشاں ہیں
ہم پہ جو گزرتی ہے ، آپ کی بلا جانے

خلق کی نگاہوں میں ، مَیں بُرا سہی ، لیکن
آپ کیوں بُرا سمجھے ، آپ کیوں بُرا جانے

یہ شرف نصیؔر اُس کی بارگہ میں کیا کم ہے
وہ تری دُعا سُن لے ، تیرا مدّعا جانے

◎

ہم ہی نہیں ہیں اُن پہ فدا، اور بھی تو ہیں

کچھ لوگ زندگی سے خفا اور بھی تو ہیں

انداز بے رُخی کے سوا اور بھی تو ہیں

فتنے تمہارے دَم سے بپا اور بھی تو ہیں

پابندِ رسم و راہِ محبت ہمیں نہیں

زنجیریانِ ذوقِ وفا اور بھی تو ہیں

رو رو کے کہہ رہا ہے کوئی داستانِ غم

ہنس کر وہ کہہ رہے ہیں، جُدا اور بھی تو ہیں

غنچوں ہی کی شگفت میں گُم ہو گئی صبا

صحنِ چمن میں تنگ قبا اور بھی تو ہیں

فرعون پر ہی ختم نہیں قصّۂ اَنا

برخود غلط بہت سے خدا اور بھی تو ہیں

مَیں نے کہا جو اُس سے کہ یُوسف ادا ہے تُو

شرما کے اُس نے مجھ سے کہا! "اور بھی تو ہیں"

مَیں ہی نہیں ہُوں کشتۂ تیغِ ستم نصیر

اُن کی گلی میں میرے سوا اور بھی تو ہیں

◎

سرِ میخانہ کوئی پارسا اب تک نہیں آیا
ہمیں پینے پلانے کا مزا اب تک نہیں آیا

کیا وعدہ ، مگر وہ بے وفا اب تک نہیں آیا
خدا معلوم کب تک آئے گا ، اب تک نہیں آیا

فلک کی گردشیں حیراں ہیں اُس کی بے مثالی پر
کوئی ایسا ستمگر دُوسرا اب تک نہیں آیا

شباب آیا ، حجاب آیا ، ادائیں آگئیں اُن کو
نہیں آیا تو اندازِ وفا اب تک نہیں آیا

نگاہیں اُن کی اُٹھیں، گھوم پھر کر غیر تک پہنچیں
مری جانب کوئی تیرِ قضا اب تک نہیں آیا

تمہیں اے ہم نشینو! نامہ بَر کی کچھ خبر لاؤ
ذرا پھر دیکھ لو یہ کیا کہا ! "اب تک نہیں آیا"؟

ہزاروں کو ہیں دعوے ناخدائی کے ، مگر دیکھو
نظر کوئی بھی ساحل آشنا اب تک نہیں آیا

مرے نزدیک تو عذرِ خطا انکارِ رحمت ہے
خطا کاروں کو اندازِ خطا ، اب تک نہیں آیا

پلٹ کر آ نہیں سکتا عدم کی راہ سے کوئی
یہ دنیا چھوڑ کر جو بھی گیا ، اب تک نہیں آیا

مرے غم خانۂ ہستی کی شب تاریک ہے کتنی
کوئی جگنو ، کوئی روشن دِیا ، اب تک نہیں آیا

یہ اک تم ہو، کہ اک مدت سے ہم کو بھولے بیٹھے ہو
یہ اک ہم ہیں ، کہ ہم کو بھولنا اب تک نہیں آیا

نصیر اُس نے دمِ رخصت نہ کیا کیا کھائی تھیں قسمیں
مگر دیکھو ذرا ! وہ بے وفا اب تک نہیں آیا

◎

فُرقت میں نَفَس نَفَس سزا ہے
اللہ ! ترا ہی آسرا ہے

صحرا میں سکون مل رہا ہے
احسان یہ اے جُنوں ! ترا ہے

آسان کب ابتدائے اُلفت
آزار و الم کی انتہا ہے

بے حدّ و حساب، اُس کی بخشش
اب بھی جو خطا نہ ہو، خطا ہے

پُھولوں سے یگانگت ہے مجھ کو
اِن میں مِرا خون دوڑتا ہے

قربت میں تھی سازِ دل کی لَے اور
فرقت میں کچھ اور ہی نوا ہے

پامالِ خزاں ضرور ہو گا
جو پُھول بہار میں کِھلا ہے

پہچان سکا نہ وہ ہمیں بھی
اُس نے تو کمال کر دیا ہے

کس کس کو سُناؤں حال غم کا
ہر شخص نصیرؔ ! پوچھتا ہے

◎

مسندِ ناز پہ جب وہ ستم ایجاد آیا
ٹُوٹ کر ایک جہاں برسرِ فریاد آیا

کام ایمان کے آخر مِرا الحاد آیا
دیکھ کر اُس بُتِ کافر کو، خدا یاد آیا

اُن کی محفل میں یہ جانے کا نتیجہ نکلا
مَیں گیا شاد، مگر لَوٹ کے ناشاد آیا

آمد و رفت کی اُس بزم میں صورت یہ رہی
بہ سر و چشم گیا، حاملِ فریاد آیا

ایک جان اور دو قالب بھی رہے ہیں ہم تم
ہائے ! کیا دَور تھا تم کو بھی کبھی یاد آیا ؟

قتل ہونے کے لئے مَیں نے جُھکا دی گردن
مسکراتا ہُوا اِس شان سے جلّاد آیا

هم بہت روئے ہیں صیّاد کے گھر میں گھر کر
چار تنکوں کا نشیمن جو ہمیں یاد آیا

جُستجو میں تری جو شخص گیا، شاد گیا
جو ترے شہر سے آیا ہے، وہ برباد آیا

اِتنا اترائیں بہاروں پہ نہ اہلِ گلشن
ہم بھی تھے مائلِ پرواز کہ صیّاد آیا

کار فرما ہے کسی مصلحتِ خاص کی رَو
ورنہ میرا یہ مقدّر، کہ تمہیں یاد آیا؟

ذہنِ انساں پہ یہ بیکار ہیں سارے پہرے
اُسے پابند کرے کون، جو آزاد آیا

داد ہو یا کہ ہو بیداد، ستم ہو کہ کرم
کچھ بھی ہو، میرا مقدّر کہ تمہیں یاد آیا

قیس و فرہاد کو یک گونہ رہا مجھ سے خلوص
جب بھی دیکھا تو پکار اُٹھے کہ اُستاد آیا

وہ بھی مِلتا جو گلے سے تو خوشی عید کی تھی
کوئی رہ رہ کے نصیر آج بہت یاد آیا

◎

وفا ہو کر، جفا ہو کر، حیا ہو کر، ادا ہو کر
سمائے وہ مرے دل میں نہیں معلوم کیا ہو کر

مرا کہنا یہی ہے، تُو نہ رُخصت ہو خفا ہو کر
اب آگے تیری مرضی، جو بھی تیرا مدعا ہو، کر

نہ وہ محفل، نہ وہ ساقی، نہ وہ ساغر، نہ وہ بادہ
ہماری زندگی اب رہ گئی ہے بے مزا ہو کر

معاذاللہ! یہ عالَم بتوں کی خود نُمائی کا
کہ جیسے چھا ہی جائیں گے خُدائی پر، خدا ہو کر

بہر صورت وہ دل والوں سے دل کو چھین لیتے ہیں
مچل کر، مسکرا کر، رُوٹھ کر، تن کر، خفا ہو کر

نہ چھوڑو ساتھ میرا ہجر کی شب ڈُوبتے تارو!
نہ پھیرو مجھ سے یوں آنکھیں، مرے غم آشنا ہو کر

اِنہیں پھر کون جانچے، کون تولے گا نگاہوں میں
اگر کانٹے رہیں گلشن میں پھولوں سے جُدا ہو کر

مرے دل نے حسینوں میں مزے لُوٹے محبّت کے
کبھی اِس پر فدا ہو کر، کبھی اُس پر فدا ہو کر

جہاں سے وہ ہمیں ہلکی سی اک آواز دیتے ہیں
وہاں ہم جا پہنچتے ہیں محبت میں ہَوا ہو کر

سنبھالیں اپنے دل کو ہم کہ روئیں اپنی قسمت کو
چلے ہیں اے نصیرِ زار! وہ ہم سے خفا ہو کر

◎

بڑھاؤ اور نہ تم بدحواسیاں میری
گھٹا سکو تو گھٹا دو اُداسیاں میری

مری اَنا سے بڑھیں خود شناسیاں میری
ڈبو گئی ہیں مجھے ناسپاسیاں میری

وہ دُشمنی، کہ رہا جس پہ دوستی کا گماں
نہ کام آ سکیں مردم شناسیاں میری

کفن بھی ہو گا مرا پاک صاف اور نیا
رہیں گی قبر میں بھی خوش لباسیاں میری

میں اُن کا ہُوں، میں اُنہیں کی تلاش میں گُم ہُوں
فریب دیں نہ مجھے خود شناسیاں میری

ادا ہو یا کہ حیا، بے رُخی ہو یا کہ جفا
اُنہیں ہے ناز، کہ سب ہیں یہ داسیاں میری

نصیر ایک جھلک حُسن کی تھی ہوش رُبا
بڑھا گیا ہے کوئی بدحواسیاں میری

◎

سینکڑوں آکے رہے دل میں گماں ساری رات

سچ کہو ، تم نے گزاری ہے کہاں ساری رات

ہر نَفَس پر تری آہٹ کا گماں ساری رات

دل رہا ہے تری جانب نگراں ساری رات

جُستجو میں تری تھک ہار کے بیٹھا نہ گیا

دل جو دھڑکا ، تو رہے اشک رواں ساری رات

غیر کو بزم میں غیبت کا بہانہ مل جائے

پھر تو لگ پائے نہ تالُو سے زباں ساری رات

دو گھڑی بھی ہے غنیمت مرے گھر میں رُکنا

میں کہاں، آپ کہاں ، اور کہاں "ساری رات"

وہ سرِ شام ذرا دیر کو آنکلے تھے

جگمگاتا ہی رہا میرا مکاں ساری رات

چاند تاروں میں تری شکل نظر آتی ہے

ہجر میں وصل کا رہتا ہے سماں ساری رات

رات بھر رُخ بھی اِدھر کا نہ کیا اُس نے نصیر

خواب کیا ، زیست رہی ہم پہ گراں ساری رات

◎

ٹکرا گئی تھی اُن کی نظر سے نظر کہیں
دل کو مرے نہ چین مِلا عمر بھر کہیں

ہو جائیے کبھی نہ کبھی جلوہ گر کہیں
سَر پھوڑ لے نہ آپ کا آشفتہ سر کہیں

قلب و نظر میں حشر بپا، جانِ مضطرب
اِس راہ سے ہُوا نہ ہو اُن کا گُزر کہیں

اے چارہ ساز! سَر نہ کھپا، اپنی راہ لے
اچھا ہُوا ہے عشق میں زخمِ جگر کہیں؟

لِلّٰہ! آپ حُسن کے تیور سنبھالیے
برباد ہو نہ جائے متاعِ نظر کہیں

کہنا پڑے گی کُھل کے مجھے داستانِ دل
جب چھڑ گئی، تو بات ہُوئی مختصر کہیں؟

مجروحِ نیشِ وقت کا اللہ رے علاج
مرہم کہیں ہے، زخم کہیں، چارہ گر کہیں

دل چاہتا ہے شامِ تمنّا، شبِ وصال
لیکن ڈھلے تو غم کی کڑی دوپہر کہیں

مجھ سے کھنچے ہوئے ہیں تو خُوش ہیں وہ غیر سے
اُس نے لگائی ہو نہ اِدھر کی اُدھر کہیں

مِلتا ہے آج کل ہمیں اِک شخص اِس طرح
بیگانہ وار، وہ بھی سرِ رہگزر کہیں

سُنتا ہُوں، لُوٹ لیتے ہیں وہ اِک نگاہ میں
خود بھی نہ لُٹ گیا ہو مرا نامہ بر کہیں

آئے ہیں آپ، اور مرے گھر، زہے نصیب
دھوکا نہ کھا رہی ہو یہ میری نظر کہیں

سوچیں تو، کہہ رہے ہیں کسے بے وفا نصیرؔ
الزام آ نہ جائے یہ اپنے ہی سَر کہیں

◎

جذبِ دل پر ناز تھا مجھ کو، مرے کام آگیا
دُور جو رہتا تھا مجھ سے، وہ سرِ شام آگیا

حُسن برساتا ہُوا جب وہ سرِ بام آگیا
میرے لب پر دفعتاً اللہ کا نام آگیا

چارہ گر بولا کہ بچنے کی کوئی اب کر سبیل
ہُوک سی دل میں اُٹھی، لب پر ترا نام آگیا

جو گزرنی تھی وہ گزری، غم نہیں دل کا ہمیں
کام آنا تھا محبّت میں اِسے، کام آگیا

التفاتِ خاص سے دیکھا جو ساقی نے کبھی
رِند یہ سمجھے، کہ گردش میں کوئی جام آگیا

بے ٹھکانے ہو کے رہ جاتے غم و رنج و ملال
سچ تو یہ ہے، دل محبّت میں بڑے کام آگیا

لُطف فرما جب نگاہِ پیرِ میخانہ ہُوئی
خُم جُھکا، ساقی کُھلا، رِند آ گئے، جام آ گیا

باغباں مسرور، گُلچیں شاد، خوش صیّاد بھی
آج آخر کون گُلشن میں تہِ دام آ گیا

گِھر گئے کس واسطے غم کی گھٹاؤں میں نصیر
کیا خیالِ گیسوئے جاناں سرِ شام آ گیا؟

◎

آمد و رفت ہے صبا کی طرح
آئے وہ، چل دیئے ہَوا کی طرح

برہمی اُس کی ہے سزا کی طرح
زُلف سَر چڑھ گئی بلا کی طرح

کم نہیں خونِ دل میں رنگینی
رنگ لاتا ہے یہ حنا کی طرح

اُن کے عہدِ شباب سے خوش ہُوں
پڑ گئی خیر سے حیا کی "طرح"

اور کچھ ہو نہ ہو بُتوں میں، مگر
بے نیازی ہے کچھ، خدا کی طرح

چاند مائل بھی ہے، گریزاں بھی
ہُو بہو میرے دلربا کی طرح

سُرخرو کر دیا زمانے نے
پیس ڈالا ہمیں حنا کی طرح

راہزن، رہ نما نہیں ہوتے
بات کرتے ہیں رہنما کی طرح

مَے یقیناً حرام ہے، زاہد!
گھونٹ دو گھونٹ پی، دوا کی طرح

مَیں بھی موجود ہوں جہاں میں مگر
ایک کھوئی ہوئی صدا کی طرح

اُن کی اُلفت کا مدّعی ہو کر
دل ہے ناکام، مدّعا کی طرح

زندگی کس کی ہو سکی ہے نصیرؔ
یہ بھی ہے، ایک بے وفا کی طرح

◎

عمر بیتی ہے حالِ غم کہتے
اور کیا داستان ہم کہتے

اپنی رُودادِ رنج و غم کہتے
کوئی سُنتا تو اُس سے ہم کہتے

آڑے آتے ہیں داغِ دل، ورنہ
کوچۂ یار کو ارم کہتے

بات چھڑتی اگر تغافل کی
ہم ستم کہتے، وہ کرم کہتے

تُو نہ چُھپتا اگر نگاہوں سے
لوگ پتھر کو کیوں صنم کہتے

وہ جو رسماً بھی مہرباں ہوتا
ہم اِسے عشق کا بھرم کہتے

حالِ غم کہہ رہا ہوں رُک رُک کر
دل دھڑکتا ہے ایک دَم کہتے

نام کیوں لے لیا مقدر کا
اُن کی زُلفوں کا ایک خَم کہتے

کبھی ملتے، تو اپنا اپنا غم
ہم سے وہ، اور اُن سے ہم کہتے

ایک اُفتاد ہو، تو ذکر کریں
دَم نکلتا ہے حالِ غم کہتے

کس نے اپنا نصیرؔ! ساتھ دیا
کس کو دُنیا میں ہمقدم کہتے

◎

ہاتھ آجائے مرے درد کا درماں کوئی
ایسی گردش بھی ہو، اے گردشِ دوراں کوئی

اب بجز قُرب نہیں زیست کا امکاں کوئی
ورنہ ہوتا نہیں شرمندۂ احساں کوئی

کھو چلا کوچۂ جاناں میں دل و جاں کوئی
یوں بھی اللہ، نہ ہو بے سر و ساماں کوئی

مطمئن سو نہ سکا خَلق میں انساں کوئی
آہی جاتا ہے نظر خوابِ پریشاں کوئی

یُوں ترے مُصحفِ رُخ پر ہیں نگاہیں اپنی
شوق سے جیسے تلاوت کرے قرآں کوئی

مضطرب مَیں بھی زمانے کی کڑی دُھوپ میں ہُوں
چاہتا ہوں کہ چُھپا لے تہِ داماں کوئی

حُسن اک قہر ہے، آفت ہے، غضب ہے یارو!
دل لگائے نہ کہیں بُھول کے انساں کوئی

آپ کی بات سمجھتا ہوں، کہوں، یا نہ کہوں
آپ دانا سہی، مَیں بھی نہیں ناداں کوئی

مُسکراتے ہیں مجھے دیکھ کے دُنیا والے
میرے اللہ نہ ہو مجھ سا پریشاں کوئی

ہے یہ اقرار کی تکرار، کہ انکار کا رنگ
کہہ رہا ہے مری ہر بات پہ "ہاں ہاں" کوئی

ہم وفا پیشہ، کریں گے نہ وفا کا چرچا
کر کے احسان جتاتا نہیں احساں کوئی

مَیں یہ کہتا ہوں، کوئی تیر ہے دل میں جیسے
وہ یہ کہتے ہیں، مچلتا نہ ہو ارماں کوئی

کج کُلاہوں سے نہیں خاک نشینوں کو غرض
اپنے گھر بیٹھے، جو ہو وقت کا سلطاں کوئی

جب ذرا ترکِ تعلّق کی چلے بات نصیرؔ
تھام لیتا ہے بڑے پیار سے داماں کوئی

◎

کہنے سُننے سے نہ آپس میں صفائی ہوگی
کچھ کہا ہم نے تو بگڑو گے ، لڑائی ہوگی

چشمِ صحرا میں نظر آئے نمی کے آثار
ہاں سبب اِس کا ، مری آبلہ پائی ہوگی

بس یہی سوچ کے لب بستہ ہیں تیرے خاموش
مُنہ سے نکلے گی اگر بات ، پرائی ہوگی

میرے نالوں میں تھا ارمانوں کا ماتم شامل
رات بھر نیند کہاں کل اُنہیں آئی ہوگی

کچھ وہ طبعًا بھی تھے شعلہ روش و گرم مزاج
یار لوگوں نے بھی کچھ آگ لگائی ہوگی

یُوں کُھلا ہے نہ کُھلے گا یہ مُعمّا دل کا
زلف سلجھاؤ گے تو عُقدہ کشائی ہوگی

التفاتِ نگہِ یار یہ کہتا ہے نصیر
اُس کی محفل میں کبھی اپنی رسائی ہوگی

◎

عشق میں صبر کارگر نہ ہُوا — آہ کی ، آہ میں اثر نہ ہُوا
نخلِ اُمید بارور نہ ہُوا — جو نہ ہونا تھا ، عمر بھر نہ ہُوا
اِتنا آساں نہیں کسی پہ کرم — آپ شرمائیں گے ، اگر نہ ہُوا
ہم ہوئے لاکھ سب سے بیگانے — وہ نہ اپنا ہُوا ، مگر نہ ہُوا
جس طرف انتظار میں ہم تھے — اُس طرف آپ کا گزر نہ ہُوا
غیر گھر کر گیا ترے دل میں — اک مرا تیرے دل میں گھر نہ ہُوا
ہم وفا کر کے بے وفا ٹھہرے — کوئی الزام تیرے سَر نہ ہُوا

میرے حالات سے نصیر اب تک
باخبر ، حُسنِ بے خبر نہ ہُوا

◎

حقیقت دیکھ لیں خود جوڑ کر تصویر کے ٹکڑے
یہ میرے دل کے ٹکڑے ہیں، یہ اُن کے تیر کے ٹکڑے

دُعا کی تھی تو تھوڑی دیر ظالم صبر کرنا تھا
تری آہ و فغاں نے کر دیئے تاثیر کے ٹکڑے

یہی جیب و گریباں تھے مرا سرمایہ لے دے کر
جُنوں نے کر دیئے آخر مری جاگیر کے ٹکڑے

وفا کا ذکر بھی ہے ، بے وفائی کی شکایت بھی
جُدا اک دُوسرے سے ہیں تری تحریر کے ٹکڑے

مخاطب ہے عَدو، لیکن نشانہ میری چاہت ہے
اِنہیں مَیں تیر سمجھوں، یا کہوں تقریر کے ٹکڑے

اثر ہو کم سے کم اِتنا تو سوزِ شمعِ محفل کا
جو گُل کترے، تو ہو جائیں وہیں گُل گیر کے ٹکڑے

وفاؤں کا محل مَیں نے جتن کر کے بنایا تھا
جفاؤں سے اُڑائے تُو نے اِس تعمیر کے ٹکڑے

کھٹکتے ہیں تو دل محسوس کرتا ہے عجب لذّت
ترے طعنے کے نشتر ہوں کہ تیرے تیر کے ٹکڑے

خزاں تک یہ قفس ہے، یہ اسیری ہے، یہ پابندی
بہار آئی، تو ہو جائیں گے خود زنجیر کے ٹکڑے

شراروں سے مری آہ و فغاں کے ہیں فلک روشن
یہ تارے ہیں، کہ میرے نالۂ شبگیر کے ٹکڑے

جو خط میں، مَیں نے اپنی غمزدہ تصویر بھی بھیجی
اُڑائے خط کے پُرزے، کر دیئے تصویر کے ٹکڑے

نہ چھُوٹے اے نصیؔر! اب آستانِ مُرشدِ کامل
ملیں مجھ کو اِسی در سے مری تقدیر کے "ٹکڑے"

◎

گھر سے دل تھامے ہوئے کیا نکلے — کوچۂ یار میں ہم جا نکلے

کاش ارماں مرے دل کا نکلے — گھر سے چل کر وہ اِدھر آ نکلے

یا تو لے جائے مجھے ساتھ اَجل — یا کوئی غم کا مداوا نکلے

تھا زمانے میں کرم کا شُہرہ — آپ تو قہر سراپا نکلے

ہر قدم پر ہیں نگاہیں مشتاق — گھر سے بے پردہ کوئی کیا نکلے

کر گیا کام ، تبسّم اُن کا — جتنے شکوے تھے وہ بے جا نکلے

ہم سمجھتے تھے جنہیں ماہ و نجُوم — آپ کے نقشِ کفِ پا نکلے

جب وہ سُنتے ہی نہیں بات مری — کس طرح دل کی تمنّا نکلے

اُن کے ہمراہ ادائیں نکلیں — وہ کبھی گھر سے نہ تنہا نکلے

مہرباں ہم پہ نہیں جب وہ نصیرؔ
کس طرح حوصلہ دل کا نکلے

◎

یہ کام ہم نے جنوں میں کیا کیا ، نہ کیا
ہُوا جو چاک گریباں سیا سیا نہ سیا

وفورِ شوق میں کیا اعتبار سانسوں کا
رہا رہا نہ رہا میں ، جیا جیا نہ جیا

ہم آتے جاتے رہے میکدے میں شام و سَحَر
شریکِ جام کسی نے کیا کیا نہ کیا

پیالہ ہاتھ میں لینا ہی میگساری ہے
بَلا سے گھونٹ جو ہم نے پیا پیا نہ پیا

ہمارا فرض تو یہ ہے کہ ہم گلہ نہ کریں
صِلہ وفاؤں کا اُس نے دیا دیا نہ دیا

تمام عمر حسینوں کو ٹوٹ کر چاہا
اُنھوں نے نام ہمارا لیا لیا نہ لیا

سلامِ شوق کیا ، جب کوئی مِلا ہم کو
جواب چاہے کسی نے دیا دیا نہ دیا

چلے بھی آئیے ! کل کا کچھ اعتبار نہیں
مریضِ ہجر ، سَحَر تک جیا جیا نہ جیا

ہم اپنی منزلِ مقصود کی لگن میں رہے
ہمارا ساتھ کسی نے دیا دیا نہ دیا

خدا گواہ ! محبّت تو کی ، وفا نہ سہی
یہ ایک زہر کا پیالہ پیا پیا نہ پیا

نصیرؔ خیر سے ہو جائے گی حیات بسر
کسی کا ہم نے سہارا لیا لیا نہ لیا

◎

اُن کی نظریں رازِ اُلفت پا گئیں
آنکھوں ہی آنکھوں میں دل تک آ گئیں

حُسن کی کرنیں تھیں ، سب پر چھا گئیں
وقت کی رفتار تک ٹھہرا گئیں

کیا بتائیں کیوں ہے آنکھوں میں نمی
کچھ پُرانی محفلیں یاد آ گئیں

حسرتیں جب تک تھیں ، دل آباد تھا
شہر ویراں ہو گیا ، وہ کیا "گئیں"

چاند کی کرنوں کو تھا خود پر غرور
تیرا جلوہ دیکھ کر شرما گئیں

بے وفا ہو کر وفا کے تذکرے
خیر سے باتیں بنانی آ گئیں

اُن کے جلووں کی کرم فرمائیاں
چاندنی سی میرے گھر برسا گئیں

فتنہ ساماں تھیں نگاہیں آپ کی
جس طرف اُٹھیں قیامت ڈھا گئیں

مَیں یہی سمجھا کہ وہ خود آ گئے
چاند کی کرنیں مجھے بہکا گئیں

خوابِ غفلت میں نصیرؔ اب تک تھا مَیں
زندگی کی ٹھوکریں چونکا گئیں

◎

فراق غم ہے، وہ غم بھی اِسے نہیں کہتے
ستم تو یہ ہے، ستم بھی اِسے نہیں کہتے

بلا ہے زُلف، یہ ہم بھی اِسے نہیں کہتے
حُضور! ابرِ کرم بھی اِسے نہیں کہتے

کچھ ایسے لوگ، محبّت کو غم کا نام دیا
وہ لوگ بھی ہیں جو غم بھی اِسے نہیں کہتے

ملی تو دیدۂ ساقی سے، تشنگی تو مٹی
بہت نہیں ہے تو کم بھی اِسے نہیں کہتے

چراغِ جادۂ اُلفت کو کیا کہے کوئی
جو تیرا نقشِ قدم بھی اِسے نہیں کہتے

وہ ہاتھ رکھ کے مِرے سر پہ، بات کرتے ہیں
قسم خدا کی، قسم بھی اِسے نہیں کہتے

تری نگاہ دل و جاں کی روشنی نہ سہی
چراغِ دَیر و حرم بھی اِسے نہیں کہتے

معاف کیجیے بے اعتنا نظر سے ہمیں
ستم نہیں، تو کرم بھی اِسے نہیں کہتے

وجودِ عکسِ تجلّی، نمود وہم و گماں
عدم ہے، اور عدم بھی اِسے نہیں کہتے

مشابہت ترے جلووں کی آفتاب میں ہے
تری مثال تو ہم بھی اِسے نہیں کہتے

وہ ہم سے کرتے ہیں باتیں ستم کے پردے میں
نصیرؔ! حُسنِ کرم بھی اِسے نہیں کہتے

◎

کہتے ہیں کوئی مول نہیں دل کا، مگر ہے
ہلکا سا تبسّم ہے، اُچٹتی سی نظر ہے

ہاں عشق نہیں اُن کو، مگر اُس کا اثر ہے
تسکین کی صُورت نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

اپنے لئے آئینہ بنایا مرے دل کو
مجھ پر یہ بڑا ہی کرمِ آئنہ گر ہے

منزل پہ اُڑائے لیے جاتی ہیں ہوائیں
ہر ذرّہ مری خاک کا سرگرمِ سفر ہے

اے ساقیِ میخانہ! عنایت کی نظر ہو
تھوڑی سی ملے مجھ کو بھی، شیشے میں اگر ہے

کلیوں کا تکلّم ہے تو پھولوں کا تبسّم
کس درجہ دل آویز، گلستاں کی سَحَر ہے

اُس زلف کے سائے میں نصیرؔ آگئے آخر
آپ اُن کے ہوئے، اُن کی بلا آپ کے سَر ہے

◎

اپنی گزری نہ کسی حال بھی آرام کے ساتھ
خود بھی گردش میں رہے گردشِ ایّام کے ساتھ

بادہ نوشی ہو بڑے چین سے، آرام کے ساتھ
چشمِ ساقی بھی جو گردش میں رہے جام کے ساتھ

ہم تری زلفِ گرہ گیر سے کُھل کھیلیں گے
عمر گزری ہے ہماری قفس و دام کے ساتھ

تیرگی جتنی بڑھی اُتنے ہی چمکے آنسو
روشنی میرے چراغوں کی بڑھی، شام کے ساتھ

وہ مرا دل تھا، یہ میخانے کا دل ہے ظالم
محتسب! مان بھی جا، ظلم نہ کر جام کے ساتھ

میری رُسوائی میں ناداں! تری رُسوائی ہے
نام تیرا بھی عبارت ہے مرے نام کے ساتھ

یہ الگ بات کہ محرومِ نظارہ تھی نظر
اک تعلّق تو رہا تیرے در و بام کے ساتھ

یہ کرم کم ہے کہ وہ یاد کریں تجھ کو نصیرؔ
پیار سے اب ہو ترا ذِکر، کہ دُشنام کے ساتھ

◎

خلوصِ دل سے جو تُو ہم پہ مہرباں ہوتا
مجال تھی کہ مخالف یہ آسماں ہوتا

نصیب میں نہ اگر تیرا آستاں ہوتا
تو کیا خبر کہ ٹھکانا مرا کہاں ہوتا

تمہارا قُرب میسّر جو میری جاں! ہوتا
بہار ہوتی ، چمن ہوتا ، آشیاں ہوتا

حُضورِ حُسن تو حرف و صدا ہے گستاخی
بس ایک اشک بہت تھا، اگر رواں ہوتا

یہ سب تمہارے تغافل کا اِک کرشمہ ہے
نہ تم بدلتے، نہ یوں مَیں ہی بدگماں ہوتا

تمہارے دَم سے ہے میرا وجود، میری نمود
تمہارا جلوہ نہ ہوتا تو مَیں کہاں ہوتا

نصیرؔ ! اُن کو سُنانا تھی داستانِ الم
اگر نہ سلسلۂ شوق درمیاں ہوتا

◎

کوئی جائے طُور پہ کس لئے کہاں اَب وہ خُوش نَظَری رہی
نہ وہ ذوقِ دیدہ وری رہا ، نہ وہ شانِ جلوہ گری رہی

جو خلش ہو دل کو سُکوں ملے ، جو تپش ہو سوزِ دروں ملے
وہ حیات اصل میں کچھ نہیں ، جو حیات غم سے بَری رہی

جو خزاں کی گرم رَوی بڑھی تو چمن کا رُوپ جُھلس گیا
کوئی غنچہ سر نہ اُٹھا سکا ، کوئی شاخِ گُل نہ ہَری رہی

مُجھے بس ترا ہی خیال تھا ترا رُوپ ، تیرا جمال تھا
نہ کبھی نگاہ تھی حُور پر ، نہ کبھی نظر میں پَری رہی

ترے آستاں سے جُدا ہُوا تو سکونِ دل نہ مجھے مِلا
مِری زندگی کے نصیب میں ، جو رہی تو دَر بدَری رہی

ترا حُسن آنکھ کا نُور ہے ، ترا لُطف وجہِ سُرور ہے
جو ترے کرم کی نظر نہ ہو ، تو متاعِ دل نظری رہی

جو ترے خیال میں گُم ہوا تو تمام وسوسے مٹ گئے
نہ جُنوں کی جامہ دَری رہی، نہ خرد کی دَرد سری رہی

مجھے بندگی کا مزا ملا ، مجھے آگہی کا صلہ مِلا
ترے آستانۂ ناز پر ، جو دھری جبیں تو دھری رہی

یہ مہ و نُجوم کی روشنی ترے حُسن کا تو بَدَل نہیں
ترا ہجر ، شب کا سہاگ تھا ، مرے غم کی مانگ بھری رہی

رہِ عشق میں جو ہُوا گزر ، دل و جاں کی کچھ نہ رہی خبر
نہ کوئی رفیق ، نہ ہم سفر ، مرے ساتھ بے خبری رہی

ترے حاسدوں کو ملال ہے ، یہ نصیر فن کا کمال ہے
ترا قول تھا جو سَنَد رہا ، تری بات تھی جو کھری رہی

◎

مِلنے جُلنے سے انحراف کیا — اُس نے انکار ، صاف صاف کیا
دل تمہاری طرف سے صاف کیا — جاؤ ہم نے تمہیں مُعاف کیا
یہ تو اُن کی پُرانی عادت ہے — جو کہا ، اُس کے برخلاف کیا
بزم میں مہرباں ہُوئے جو کبھی — تذکرہ قاف تا بہ قاف کیا
ایک ہیں اُن کو اپنے بیگانے — جو مِلا اُس پہ ہاتھ صاف کیا
اُس کی بخشش نے کی پذیرائی — جب گناہوں کا اعتراف کیا
جان کر اُن سے بے رُخی برتی — ہم نے اپنا حساب صاف کیا
دیکھیے ! پھر خطا ہُوئی سرزد — آپ نے کیوں مجھے مُعاف کیا
وہ مخالف نہ تھے ، مگر اُن کو — دشمنوں نے مرے خلاف کیا

آج ہم نے نصیر مستی میں
کوچۂ یار کا طواف کیا

جو کفن باندھ کے سر سے گزرے
وہ تری راہ گزر سے گزرے

دل سے گزرے کہ جگر سے گزرے
ہم کو کیا، کوئی جدھر سے گزرے

اُن میں شامل تھا مرے دل کا لہو
اشک جو دیدۂ تر سے گزرے

راستے بند، بَلا کے پہرے
کوئی گزرے تو کدھر سے گزرے

اور کوئی نہ بچا آنکھوں میں
آپ ہی آپ نظر سے گزرے

دار کی راہ نہ گزرا کوئی
ایک ہم تھے جو اُدھر سے گزرے

آپ کی بزم میں آ کر لاکھوں
جان سے، دل سے، جگر سے گزرے

دیدہ و دل پہ قیامت گزری
بن سنور کر وہ جدھر سے گزرے

روک اشکوں کا یہ سیلاب نصیرؔ
اِس سے پہلے کہ یہ سر سے گزرے

نَو گرفتارِ غمِ اُلفت ہوں اے ہمدم! ابھی
دَرد اُٹھتا ہے مرے دل میں، مگر کم کم ابھی

آشکارا ہو نہیں پایا ہے تیرا غم ابھی
اے دلِ ناشاد! تُو فریاد کر پیہم ابھی

مَیں بھی رُوٹھا آپ سے، میں بھی ہُوا برہم ابھی
بے وفا مَیں بھی ہُوں، لیکن آپ سے کم کم ابھی

دیدنی ہے دوستوں کا یہ خُلوصِ پُر فریب
دے رہے ہیں غم وہی، جو تھے شریکِ غم ابھی

سامنا اُن کا میسّر ہو تو پھر کُھل کر برس
اے سحابِ گریۂ چشمِ تمنّا! تھم ابھی

ہم نے مستقبل کی سرحد پر کمندیں ڈال دیں
آپ کو کیا فکر، ماضی کا کریں ماتم ابھی

دیکھ ! لب پر آ نہ جائے کوئی حرفِ آرزو
اے دلِ ناداں ! مزاجِ یار ہے برہم ابھی

غیر ممکن ہے ترے غم کی پذیرائی نہ ہو
بے وفا! اِتنے گئے گزرے نہیں ہیں ہم ابھی

رفتہ رفتہ ہو گئے احباب سب رخصت نصیرؔ
میرے سینے میں مگر تازہ ہے اُن کا غم ابھی

◎

یہ نظر کی زد ہے ظالم ، مرا دَم نکل نہ جائے
مجھے صرف اِس کا ڈر ہے کہ یہ تیر چل نہ جائے

وہ اُٹھی ہے آتشِ غم کہ نَفَس نَفَس ہے سوزاں
مری رُوح تپ نہ اُٹھے ، مرا جسم جل نہ جائے

مرے رازداں سے ہنس کر وہ خطاب کر رہے ہیں
کہیں ہچکیوں میں آ کر کوئی راز اُگل نہ جائے

تری بزم میں جو ہم ہیں تو یہاں پہ غیر کیوں ہو
یہ خلش نکل نہ جائے ، یہ عذاب ٹل نہ جائے ؟

وہ اُٹھا رہے ہیں چلمن، وہ دِکھا رہے ہیں صورت
کہیں ہوش اُڑ نہ جائیں، کہیں دل مچل نہ جائے

مَیں چراغِ ناتواں ہُوں کوئی دم کا میہماں ہُوں
مرے سامنے سے اُٹھ کر کوئی ایک پل نہ جائے

وہ نصیرؔ سُن رہے ہیں مرے دَرد کا فسانہ
مجھے ہر گھڑی ہے دھڑکا کہیں رُخ بدل نہ جائے

◎

تم اک نگاہ کبھی دل پہ ڈال کر دیکھو
اِس آئینے کی ذرا دیکھ بھال کر دیکھو

چلو یہ زَعم بھی اپنا نکال کر دیکھو
تمہارے در پہ ہُوں، اب مجھ کو ٹال کر دیکھو

جواب تم کو ملے گا، سوال کر دیکھو
ہماری آنکھوں میں آنکھیں تو ڈال کر دیکھو

تمہاری راہ میں مٹنا ہے زندگی میری
یقیں نہیں تو مجھے پائمال کر دیکھو

یہ غیر ہے، نہ کسی کا ہُوا نہ ہوگا کبھی
تم آستین میں یہ سانپ پال کر دیکھو

بڑا ہی لطف تھا آپس کی اُس محبت میں
جو ہو سکے تو وہ رشتے بحال کر دیکھو

ہزار تاڑنے والے ہیں اِن اشاروں کے
اِدھر اُدھر بھی ذرا دیکھ بھال کر، دیکھو

جنابِ شیخ کسی کی کبھی نہیں سُنتے
نتیجہ کچھ بھی نہیں قیل و قال کر دیکھو

خُمار میں ہوں، تو رندوں کا امتحاں بے سُود
مزا تو جب ہے کہ ساغر اُچھال کر دیکھو

نظر کی ٹھیس لگے گی تو ہو گا چکنا چُور
دل آئنہ ہے، ذرا تم سنبھال کر دیکھو

اُمیدِ وصل نہیں، کچھ جواب تو دیں گے
نصیرؔ! آج تم اُن سے سوال کر دیکھو

◎

جَم کے بیٹھیں کبھی، ایسی بھی ملاقات تو ہو
تم کہو شام ہوئی، مَیں یہ کہوں رات تو ہو

کم سے کم غیر سے یُوں ہنس کے نہ ہو سرگوشی
آپ کی بزم میں اِتنی مری اوقات تو ہو

مجھ پہ یہ بارشِ الطاف، عَدو بھی دیکھے
ہو نہ ہو کوئی، مگر آج وہ کم ذات تو ہو

بے سبب ترکِ تعلّق پہ اُتر آئے تم
کوئی رنجش کا قرینہ ہو، کوئی بات تو ہو

بادۂ ناب کا کیا ہے وہ تو پی ہی لیں گے
مہرباں پہلے مگر پیرِ خرابات تو ہو

آج آئے ہیں تجھے دیکھنے تیرے سائل
دل کے کشکول میں دیدار کی خیرات تو ہو

جان و دل لے کے فقط آئے ہو محفل میں نصیرؔ
دیکھ لیتا تھا، کوئی کام کی سوغات تو ہو

◎

خموشی کی زباں میں گفتگو کرنی بھی آتی ہے
ہمیں اشکوں سے شرحِ آرزو کرنی بھی آتی ہے

فقط ہاتھوں سے مہندی کو رچانا ہی نہیں آتا
اُنہیں ہر آرزو میری لہُو کرنی بھی آتی ہے

نہیں دُشوار کوئی، منزلِ مقصود کا ملنا
سفر درپیش ہو، تو جستجو کرنی بھی آتی ہے

اَدب مانع ہے، ورنہ بارگاہِ ناز میں جا کر
ہمیں ہر بات اُن کے رُوبرو کرنی بھی آتی ہے

کہیں ایسا نہ ہو گھبرا کے وہ محفل سے اُٹھ جائیں
کہ اِس ناچیز کو کچھ ہا و ہُو کرنی بھی آتی ہے

کسی کے مرتبے کا پاس ہے وقتِ سخن لازم
تمہیں واعظ کسی سے گفتگو کرنی بھی آتی ہے؟

بہا کر خونِ دل ، ارمان سب اپنے لُہو کر کے
ترے کوچے کی مٹّی سُرخرو کرنی بھی آتی ہے

جنابِ شیخ اکثر میکدے سے بے پیے نکلے
بحمد اللہ عبادت بے وضُو کرنی بھی آتی ہے

نصیرؔ اپنوں کی عزّت لوگ کرتے آئے ہیں، لیکن
وہ ہم ہیں جن کو تعظیمِ عَدو کرنی بھی آتی ہے

◎

جو مہرباں تھا ستم گر ہُوا ، غضب کیا ہے
الٰہی خیر ، وہ جب کیا تھا اور اب کیا ہے

یہ دوستی بھی ہو اک دُشمنی ، عجب کیا ہے
کبھی خفا ہو کبھی مہرباں ، یہ سب کیا ہے ؟

نگاہ دیکھ رہی ہے ، سمجھ نہیں سکتی
خبر نہیں یہ تماشائے روز و شب کیا ہے

یہ دل اُنہیں کا تھا ، یہ جان بھی اُنہیں کی سہی
شکایت اُن کو محبّت میں ہم سے اب کیا ہے

خدا گواہ ! کہ مَیں اُن سے مانگ لُوں اُن کو
کبھی وہ پوچھ کے دیکھیں ، مری طلب کیا ہے

کہا یہ چارہ گروں نے ، دوا ہے بعد کی بات
پتہ چلے کہ ترے دَرد کا سبب کیا ہے

تمہارے وعدۂ فردا کا اعتبار تو ہو
گُزر ہی جائے گی ، فرقت کی ایک شب کیا ہے

خدا گواہ ، کہ اِس پر مجھے گھمنڈ نہ تھا
مگر یہ حشر میں جا کر کُھلا ، نَسَب کیا ہے

نصیؔر ! دل کی خوشی پر ہے انحصارِ نشاط
اُداس دل ہو ، تو پھر محفلِ طرب کیا ہے

◎

آ گئے وہ میری چشمِ معتبر کے سامنے
پردہ کب ٹھہرا نگاہِ پردہ در کے سامنے

وہ پسِ چلمن ہیں ، ہم ہر دم نظر کے سامنے
آج ہم دیوار بن بیٹھے ہیں ، دَر کے سامنے

اِن غریبوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آتی دوا
چارہ گر بے بس ہُوئے دردِ جگر کے سامنے

بُجھ گیا بزمِ فلک کا نور برساتا چراغ
داغِ دل چمکا جو خُورشیدِ سَحَر کے سامنے

دیکھیے اب اذنِ سجدہ کس کو ہوتا ہے نصیب
سَر بہ خَم دنیا کھڑی ہے سنگِ در کے سامنے

ہم طلسمِ عرصۂ ہستی میں کھو بیٹھے حواس
کچھ کرشمے آ گئے ایسے ، نظر کے سامنے

حشر میں کُھل جائے گا انساں پہ خود اپنا بھرم
آئے جب اعمال سارے عمر بھر کے "سامنے"

اِک ذرا دیوانگی کچھ اور ہونے دو فزوں
ہیچ ہے دیوارِ زنداں میرے سَر کے سامنے

مَیں نے لکھا تھا کہ دیں فوراً مرے خط کا جواب
پُرزے پُرزے کردیا خط نامہ بَر کے سامنے

غم نہیں کچھ حاسدوں کی حرف گیری کا نصیرؔ
رات کے تارے کہیں ٹھہرے سَحَر کے سامنے ؟

◎

وہ پھول ہُوں کہ کِھلا ہُوں صبا کے رستے میں
خزاں تو پھینک گئی تھی قضا کے رستے میں

جُنوں نے ساتھ دیا ہے خدا کے رستے میں
خرد تو چھوڑ گئی مجھ کو لا کے رستے میں

بہ زُعمِ خویش مرے راہبر بنے جو لوگ
پلٹ گئے وہی ، کانٹے بچھا کے رستے میں

خداگواہ ، کہ طاری ہے جذب کا عالَم
اب آئے کوئی نہ اُن کے گدا کے رستے میں

جسے ہماری طلب ہو ، وہ ہم تک آ پہنچے
یہ کہہ رہے ہیں وہ پہرے بٹھا کے رستے میں

برائے دید نہ آئے ، تو کیا کرے کوئی
جمے ہیں آپ تو محفل جما کے رستے میں

وہ اپنے گھر میں بٹھا کر مجھے بُرا کہتے
جلی کٹی نہ سناتے بُلا کے رستے میں

کہا جو مَیں نے کہ مَیں بھی چلوں تمہارے ساتھ
تو مجھ کو ٹال دیا مسکرا کے رستے میں

ہزار قُرب ہو ، فطرت بدل نہیں سکتی
دیارِ کُوفہ بھی ہے کربلا کے رستے میں

کہاں سے دشتِ غریباں میں روشنی آئے
چراغ کون جلائے ہَوا کے رستے میں

کبھی تو ہوگی رسائی نصیرؔ اُس در تک
غبار بن کے پڑے ہیں صبا کے رستے میں

◎

جگمگانے لگی بام و دَر چاندنی
ہر طرف آرہی ہے نظر چاندنی

وہ نہیں ہیں تو برق و شرر چاندنی
ڈھونڈ لے اب کوئی اور گھر چاندنی

اُن کے جلووں کی تشریح ممکن نہیں
سَر بہ سَر نُور ہیں ، سَر بہ سَر چاندنی

یُوں ہی کہتے نہیں اُن کو رشکِ قمر
وہ جدھر ہوں گے ہوگی اُدھر چاندنی

تیرگی ، تیرگی ہی رہے گی سدا
لاکھ پٹکا کرے اپنا سَر چاندنی

میری تاریک قسمت کا عالَم یہ ہے
چاند بے نُور ہے ، بے اثر چاندنی

حُسن ہے اُن کا یُوں بزم میں ضَو فگن
جیسے چھائی ہو ماحول پَر چاندنی

آگیا ہے مرا چاند شاید نظر
ہے اُفُق تا اُفُق جلوہ گر چاندنی

اُن کے جلووں میں گُم ہو کے ممتاز ہو
ٹھوکریں کھائے کیوں دربدر چاندنی

بے حجابانہ نکلیں نصیرؔ آج وہ
مَیں بھی دیکھوں سرِ رہگزر چاندنی

◎

دل میں ارمان ، قہر ہو جیسے   کوئی طوفاں کی لہر ہو جیسے
اَب یہ عالم ہے آرزوؤں کا   دل میں آباد شہر ہو جیسے
اللہ اللہ ، تلخیاں غم کی   جام ، تلخابِ زہر ہو جیسے
آنکھ سے اِس طرح ہیں اشک رواں   خُون کی ایک لہر ہو جیسے
پی تو لیتے ہیں حضرتِ واعظ   لیکن ایسے ، کہ زہر ہو جیسے
دل کی بربادیوں کا حال نہ پوچھ   کوئی ویران شہر ہو جیسے
یُوں تبسّم ہے اُن کے ہونٹوں پر   مَے کی ، ساغر میں لہر ہو جیسے

مُنہ بناتے ہیں اِس طرح وہ نصیرؔ
میری ہر بات زہر ہو جیسے

◎

فیصلہ اُن کا ، ہمارا ، ہو گا / ایک دن ہونا ہے ایسا ، ہو گا

اک نہ اک دن یہ تماشا ہو گا / خونِ دل ، خونِ تمنّا ہو گا

ہم جہاں ٹھہریں، جدھر سے گزریں / وہی منزل ، وہی رَستا ہو گا

ٹُوٹتی ہو گی قیامت اُس پر / جو ترے شہر میں بستا ہو گا

غیر پر آج جفا کی اُس نے / کل مرے ساتھ بھی ایسا ہو گا

جب نقاب آپ اُٹھاتے ہوں گے / نُور ہی نُور برستا ہو گا

جو مرے مُنہ پہ بُرائی کر دے / میرے حق میں وہی اچھا ہو گا

یُوں تو ہونے کو حسیں اور بھی ہیں / آپ سا کوئی مگر کیا ہو گا

میرا خاموش ہی رہنا بہتر / بات بڑھ جائے گی، چرچا ہو گا

ہم بُرے، سارے زمانے سے بُرے / کوئی اچھا ہے تو اچھا ہو گا

میکشوں سے نہ اُلجھ اے واعظ! / بے پیے مُفت میں رسوا ہو گا

بے مثالی کا غلط ہے دعوٰی / کوئی مجھ سا ، کوئی تجھ سا ہو گا

تم کو اُن کی جو تمنّا ہے نصیر

چاہتے جاؤ ، جو ہو گا ، ہو گا

◎

دل خُوں ہو تو کیوں کر نہ لُہو آنکھ سے برسے

آخر کو تعلّق ہے اِسے دیدۂ تر سے

تَن تَن کے بہت آپ نہ نکلا کریں گھر سے

ٹکراؤ نہ ہو جائے کہیں اہلِ نظر سے

کچھ دیر تو اِس قلبِ شکستہ میں بھی ٹھہرو

یُوں تو نہ گزر جاؤ اِس اُجڑے ہوئے گھر سے

ہر موج ہے طوفانِ حوادث کی حُدی خواں

مشکل ہے نکلنا مری کشتی کا بھنور سے

یہ حُسن ، یہ شوخی ، یہ تبسّم ، یہ جوانی

اللہ بچائے تمھیں بدبیں کی نظر سے

خورشید تو کیا ، غیرتِ خورشید ہُوا ہے

وہ ذرّہ جو اُبھرا ہے تری راہگزر سے

نکلی نہ جو دیدار کی حسرت تو یہ ہوگا

سَر پھوڑ کے مر جائیں گے دیوار سے، در سے

سَو[100] رنج ہیں، سَو شکوہ شکایات ہیں، لیکن

مجبور ہیں، کچھ کہتے نہیں آپ کے ڈر سے

صیّاد! خدا خیر کرے اہلِ چمن کی

دیکھے ہیں فضاؤں میں کچھ اُڑتے ہوئے پَر سے

وہ رُوٹھ گئے ہم سے، جدا اُن سے ہوئے ہم

اب چھیڑ اُٹھے گی نہ اِدھر سے نہ اُدھر سے

لوگوں کا حسد شعر کی شہرت سے بڑھے گا

خوف آتا ہے خود مجھ کو نصیرؔ اپنے ہنر سے

◎

مَیں جو پہنچا تو برسنے لگے مجھ پر ٹکڑے

چشمِ ساقی سے ہُوئے شیشہ و ساغر ٹکڑے

پہلے تو اُس نے کیے دل کے بہتّر[72] ٹکڑے

اور پھر دیکھ رہا ہے وہ مِلا کر ٹکڑے

چاہیئے مُجھ کو ترے خوانِ کرم کا صدقہ

مانگنے آیا ہُوں میں بھی ترے دَر پر ٹکڑے

شیشۂ دل تری نظروں سے نہ ٹکرائے کہیں

یہ نظر وہ ہے جو کر دیتی ہے پتّھر ٹکڑے

جُرم ہے عرضِ تمنّا، تو سزا دے قاتل!

ہے یہی دل میں تو آ! دل کے مرے کر ٹکڑے

مَیں ترے در کا بھکاری، ترے ٹکڑوں کا پلا

جو ترے در سے مِلیں، ہیں وہی بہتر ٹکڑے

حشر ہے اُس کی ادا اور قیامت ہے نظر
دل تو دل، ہو کے رہے سدِّ سکندر ٹکڑے

ہم فقیروں کا نہیں اور سہارا کوئی
آپ تقسیم کیے جائیں برابر ٹکڑے

شیشۂ دل تھا مرا ٹوٹ گیا، ٹوٹ گیا
چُن لئے آپ نے کیا سوچ سمجھ کر ٹکڑے

مَیں تو ادنیٰ ہوں، مگر ہے مری نسبت عالی
مجھ سے ٹکرائے، تو ہو بختِ سکندر ٹکڑے

مجھ گنہگار پہ مولیٰ کی عنایت ہے نصیؔر
بخش دیتا ہے مجھے اپنا سمجھ کر "ٹکڑے"

◎

بس اِتنی کامرانی چاہتا ہوں
کسی کی مہربانی چاہتا ہوں

شرابِ ارغوانی چاہتا ہوں
مگر وہ بھی پرانی چاہتا ہوں

ڈبو دیجے مجھے سیلِ الم میں
اب اُونچا سر سے پانی چاہتا ہوں

نہ کھیلیں مجھ سے یُوں الفاظ کا کھیل
محبّت پُر مَعانی چاہتا ہوں

سہارا دو مجھے اپنی نظر کا
علاجِ ناتوانی چاہتا ہوں

جو تیری زُلف کے سائے میں گزریں
وہی راتیں سہانی چاہتا ہوں

تمھیں کیوں بے وفا کہنے لگا مَیں
یہ تہمت خود اُٹھانی چاہتا ہوں

یہ زخمِ دل تو بھر جائے گا اک دن
کوئی اَن مِٹ نشانی چاہتا ہوں

نصیؔر! الفاظ بے معنیٰ رہے سب
اب اشکوں کی روانی چاہتا ہوں

◎

اشتیاقِ دید تھا آخر اُدھر جانا پڑا
اُن کی محفل میں بہ اندازِ نظر جانا پڑا

محو کر کے رنج و رسوائی کا ڈر، جانا پڑا
تیرے کوچے میں نہ جانا تھا، مگر جانا پڑا

عقل نے روکا بھی، دل تھا فتنہ گر، جانا پڑا
بے بُلائے بھی کچھ انسانوں کے گھر جانا پڑا

سیرِ گُل کا مرحلہ تھا دامِ ہمرنگِ زمیں
لے چلی بادِ صبا ہم کو جدھر، جانا پڑا

اوّل اوّل تو رہی دل سے مرے بیگانگی
آخر آخر اُن کو شیشے میں اُتر جانا پڑا

مسکرانے کی سزا ملنی تھی صحنِ باغ میں
پُھول کی ایک ایک پتّی کو بکھر جانا پڑا

دربدر پھرنے سے بہتر ہے کہیں کا ہو رہے
ہم چلے جائیں گے اُس در تک، اگر جانا پڑا

بے رُخی اُن کی مسلسل دیکھ کر آخر نصیر
بزم سے اُٹھ کر ہمیں باچشمِ تر جانا پڑا

◎

دل اگر بے غبار ہو جائے　　حق کا آئینہ دار ہو جائے

جو نظر آر پار ہو جائے　　وہی دل کا قرار ہو جائے

موت کس مُنہ سے آئے بالیں پر　　تُو اگر ایک بار "ہو جائے"

اک تبسم سہی ، وفا نہ سہی　　زندگی پُر بہار ہو جائے

بے حد و بے حساب اُس کا کرم　　دل اگر شرمسار ہو جائے

آئنہ اپنے سامنے سے اُٹھا !　　یہ نہ ہو، خُود سے پیار ہو جائے

کُھل کے ہر ایک سے مِلیں جو نصیرؔ !
سَر پہ دنیا سوار ہو جائے

◎

نہ ہوائے عیش و نشاط میں مجھے سیم و زر کی تلاش ہے
جو سکونِ قلب عطا کرے ، مجھے اُس نظر کی تلاش ہے

جو ہے قبلہ گاہِ نگاہ و دل ، اُسی سنگِ در کی تلاش ہے
جو ترے حُضور جُھکا رہے ، مجھے ایسے سَر کی تلاش ہے

ہمیں دردِ دل جو عطا ہُوا تو نوائے عشق کی لَے مِلی
اِسے کھوئیں گے نہ کسی طرح ، یہ تو عمر بھر کی تلاش ہے

اِسی کشمکش میں ہے زندگی اِسی ردّ و کد میں ہے آدمی
کبھی دردِ دل کی ہے آرزو، کبھی چارہ گر کی تلاش ہے

ترے حُسن سے جو طلوع ہو، ترے نُور سے جو شروع ہو
مجھے ایسی ضَو کی ہے جُستجو، مجھے اُس سَحَر کی تلاش ہے

کوئی ساتھ ہو تو مزا رہے کہ اکیلے لطفِ سفر نہیں
کسی ہم قدم کی ہے آرزو، کسی ہم سفر کی تلاش ہے

یہ ہوائے شام و سحر کہیں ہمیں اور سمت نہ لے اُڑے
تری رہگزر کی ہیں خاک ہم، تری رہگزر کی تلاش ہے

جو حسیں بھی پردہ نشیں بھی ہو، مری آرزو کا امیں بھی ہو
مجھے ڈھونڈنا ہے کہیں بھی ہو، مجھے اُس کے دَر کی تلاش ہے

کوئی غم گسار مرا نہیں، کوئی راز دار مِلا نہیں
اُنہیں خط لکھوں بھی تو کیا لکھوں، ابھی نامہ بر کی تلاش ہے

جسے دیکھنے کی طلب رہی، کبھی میری جس نے خبر نہ لی
مرے دل کا چین تو ہے وہی، اُسی بے خبر کی تلاش ہے

کہیں اور اپنا گزر نہیں، کہیں اور جائیں نصیر کیوں
وہی ایک دَر ہے نگاہ میں، اُسی ایک دَر کی تلاش ہے

◎

اُن سے ہر وقت مری آنکھ لڑی رہتی ہے
کیا لڑاکا ہے کہ لڑنے پہ اَڑی رہتی ہے

دیکھ کر وقت کے مقتل میں مری شانِ وُرود
ڈر میں قاتل ہی نہیں، موت کھڑی رہتی ہے

تیری تصویر مرے دل میں نگینے کی طرح
جگمگاتی ہے، چمکتی ہے، جڑی رہتی ہے

لوگ سچ کہتے ہیں پامالِ محبت مجھ کو
میری چاہت ترے قدموں میں پڑی رہتی ہے

آفتیں لاکھ ہوں، دیکھا نہ کبھی چہرۂ یاس
مجھ کو اللہ سے اُمید بڑی رہتی ہے

جو کبھی خونِ شہیداں سے حنا بند رہے
اب اُنہیں پھول سے ہاتھوں میں چھڑی رہتی ہے

یُوں نہ اِترا! کہ جوانی بھی ہے آنی جانی
چاندنی چاند کی دوچار گھڑی رہتی ہے

گریۂ چشم کا اُلفت میں یہ عالَم ہے نصیرؔ!
کوئی موسم بھی ہو، ساون کی جھڑی رہتی ہے

◎

کیجیے! جو ستم رہ گئے ہیں
جان دینے کو ہم رہ گئے ہیں

بانٹ لیں سب نے آپس میں خوشیاں
میرے حصّے میں غم رہ گئے ہیں

قافلے والے منزل پہ پہنچے
یہ نہ دیکھا کہ ہم رہ گئے ہیں

اب نہ اُٹھنا سرہانے سے میرے
اب تو گنتی کے دَم رہ گئے ہیں

یہ گلی کس کی ہے اللہ اللہ
اُٹھتے اُٹھتے قدم رہ گئے ہیں

کائناتِ جفا و وفا میں
ایک تم، ایک ہم رہ گئے ہیں

دیکھ کر اُن کے منگتوں کی غیرت
دَنگ اہلِ کرم رہ گئے ہیں

ہم سے اللہ والے کہاں اب
آپ جیسے صنم رہ گئے ہیں

دو قدم چل کے راہِ وفا میں
تھک گئے تم، کہ ہم رہ گئے ہیں

وہ تو آکر گئے بھی کبھی کے
دل پہ نقشِ قدم رہ گئے ہیں

آج ساقی پلا شیخ کو بھی
اک یہی محترم رہ گئے ہیں

وہ گئے، جن کے دَم سے تھی رونق
اور رہنے کو ہم رہ گئے ہیں

اُن کی ستاریاں کچھ نہ پُوچھو
عاصیوں کے بھرم رہ گئے ہیں

دل نصیرؔ اُن کا تھا، لے گئے وہ
غم خدا کی قسم رہ گئے ہیں

◎

رہنے لگی وہ زلفِ گرہ گیر سامنے
ہر وقت اب تو ہے یہی زنجیر سامنے

آتے ہیں خیر سے وہ نظر اب کبھی کبھی
آنے لگی ہے خواب کی تعبیر سامنے

ہوجائے گا مُحاسبہ دشمن کا خود بخود
آجائیں گے فریب کے سب تیر سامنے

اے دل! ذرا سنبھل کے اُٹھانا اُدھر قدم
وہ دیکھ! وہ ہے زلف کی زنجیر سامنے

مبنی منافقت پہ ہے یاروں کا یہ چلن
تذلیل میری بعد میں، توقیر سامنے

تدبیر سے بدل نہیں سکتے مقدّرات
ہوگا وہی، جو لائے گی تقدیر سامنے

دیوانہ تو بہار میں صحرا کو چل دیا
ٹوٹی پڑی ہوئی ہے وہ زنجیر سامنے

کیا لکھ دیا ہے مَیں نے کہ تم ہو گئے خفا
لاؤ تو اک ذرا مری تحریر سامنے

ہنس کر نصیرؔ سے بھی تو کچھ گفتگو کریں
بیٹھا ہُوا ہے آپ کا دِل گیر سامنے

◎

لُوٹ لیں وہ، دلِ حزیں! نہ کہیں
آ! چھپا لُوں تجھے کہیں نہ کہیں

سخت مشکل ہے جُستجو اُن کی
کھو کے رہ جائیں اب ہمیں نہ کہیں

بُت کدہ ہو کہ اوجِ کعبہ ہو
سر جُھکانا تو ہے کہیں نہ کہیں

ہرطرف اُس کو ڈھونڈنے والے!
وہ چُھپا ہو ترے قریں نہ کہیں

یُوں تکلّف نہ کر تسلّی میں
اور ہو جائیں ہم حزیں نہ کہیں

برق سے آشیاں بچایا ہے
پُھونک دے آہِ آتشیں نہ کہیں

دوجہاں چھوڑ، دل میں ڈھونڈ اُسے
دیکھ! موجود ہو یہیں نہ کہیں

چار تنکے ہیں آشیانے کے
رکھ ہی لیں گے اِنہیں کہیں نہ کہیں

اپنے پتوار خود سنبھال نصیرؔ!
ناؤ ہو جائے تہ نشیں نہ کہیں

◎

کانپ اُٹھتی ہیں شاخیں تو لرزتی ہے صبا بھی
وہ ضرب ہے غنچوں کے چٹکنے کی صدا بھی

انسان کو جائز نہیں شک اِس میں ذرا بھی
صادق ہو طلب دل کی تو مِل جائے خدا بھی

پرکھو ہمیں، ہے تم کو محبّت جو ذرا بھی
ہر قسم کا انسان ہے، اچّھا بھی بُرا بھی

مدّت ہُوئی محرومِ تجلّی ہیں نگاہیں
اے شاہدِ اطلاق! ذرا طُور پہ آ بھی

یہ کہہ کے مرے پاس سے رخصت ہُوا ظالم
ملتے ہیں اگر لوگ، تو ہوتے ہیں جُدا بھی

اے سینۂ افلاک! نہ ہو برق پہ نازاں
ہے شعلۂ جوّالہ مری آہِ رسا بھی

طے ہو گئے پَل بھر میں مقاماتِ محبّت
جھپکی تھیں نگاہیں ، کہ وہ آیا بھی ، گیا بھی

فرقت میں تو مرنا بھی گوارا نہیں مجھ کو
تم سامنے آجاؤ تو آجائے قضا بھی

اچھّا ہُوا عُقدہ نہ کھُلا میرے لُہو کا
خنجر ہی نہیں ہاتھ میں ، ہے رنگِ حنا بھی

وہ پرسشِ احوال کو آج آئے تھے شاید
سُنتے ہیں نصیؔر آپ نے کچھ اُن سے کہا بھی

◎

محبّت میں ہماری اشک افشانی نہیں جاتی
بھری برسات ہے دریا کی طُغیانی نہیں جاتی

مصیبت ٹل نہیں سکتی ، پریشانی نہیں جاتی
کسی کی بھی نصیحت عشق میں مانی نہیں جاتی

جو کل تک دَیر تھا ہم نے اُسے کعبہ بنا ڈالا
مگر اِس پر بھی اپنی کُفر سامانی نہیں جاتی

مریضِ ہجر کو اب آپ پہچانیں تو پہچانیں
فرشتے سے اَجل کے شکل پہچانی نہیں جاتی

تمہارا آستاں ہے اب ہماری آخری منزل
کسی بھی دَر کی ہم سے خاک اب چھانی نہیں جاتی

قیامت ہے تمہارا بن سنور کر سامنے آنا
مرا کیا ذِکر ، آئینے کی حیرانی نہیں جاتی

وہی خودداریاں ہیں ، تمکنت ہے ، بے نیازی ہے
فقیری میں بھی اپنی شانِ سُلطانی نہیں جاتی

یہ ممکن ہے ترے کوچے میں رہ کر جان سے جائیں
مگر تا مرگ تیرے دَر کی دربانی نہیں جاتی

تری رنجش ہو ، تیری بے رُخی ہو ، بدگمانی ہو
بڑی مشکل سے جاتی ہے ، یہ آسانی نہیں جاتی

تمھاری ناشناسائی کا شکوہ کیا کروں تم سے
مجھی سے جب تمھاری شکل پہچانی نہیں جاتی

جُنونِ شوق سے جو بستیاں آباد ہوتی ہیں
بہاریں لاکھ آئیں ، اُن کی ویرانی نہیں جاتی

محبّت تو نصیؔر ایسا تلاطُم خیز دریا ہے
سفینے غرق ہو جاتے ہیں ، طُغیانی نہیں جاتی

◎

اُس کے کوچے کے کہاں تک کوئی چکّر کاٹے
اب سُبُک دوش کرے یُوں ، کہ مرا سَر کاٹے

صبحِ آلام ، شبِ غم ، کوئی کیوں کر کاٹے
دن مصیبت کے کہاں تک دلِ مضطر کاٹے

بے سُتوں سے یہ اُبھرتی ہے صدائے شیریں
کوئی فرہاد بنے ، تیشے سے پتّھر کاٹے

اُس سے پُوچھے کوئی ایامِ اسیری کا عذاب
زندگی اپنی جو صیّاد کے گھر پر کاٹے

نہ مِلا تُو ، نہ ملاقات کی صورت نکلی
مدّتوں ہم نے ترے شہر کے چکّر کاٹے

زُلف وہ سانپ ، کہ لوٹے ہے ترے قدموں پر
غیر کے شانوں پہ بکھرے ، تو برابر کاٹے

موت اچھی کہ پسِ مرگ سکوں ملتا ہے
زندگی کون شب و روز تڑپ کر کاٹے

ایسے وحشی کا اگر ہو تو ٹھکانا کیا ہو
دشت میں جس کو نہ چین آئے، جیسے گھر کاٹے

ساقیِٔ کوثر و تسنیم سے نسبت ہے نصیرؔ!
کیوں نہ دنیا مرے میخانے کے چکّر کاٹے

◎

تجلّی کا ایسا اثر کس لئے ہے — ترا حُسن دیوانہ گر کس لئے ہے

خدا جانے وہ خودنگر کس لئے ہے — سدا آئینے پر نظر کس لئے ہے

تمہیں بھی اگر مجھ سے ہے کچھ محبّت — تو پھر بے رُخی اس قدر کس لئے ہے

نہ ہو زخم اچّھا یہ میرا مقدّر — پریشاں دلِ چارہ گر کس لئے ہے

جگا کر مری چند تاریک راتیں — نہاں اب وہ رشکِ قمر کس لئے ہے

نہیں اذنِ سجدہ جو میری جبیں کو — تو پھر یہ ترا سنگِ در کس لئے ہے

فلک پر ہیں کیا یہ بھی گم کردہ منزل — یہ تاروں کا ہر شب سفر کس لئے ہے

گیا، اور خط بھی اُسے دے کے پلٹا — یہ چُپ چُپ مگر نامہ بَر کس لئے ہے

لگائے ہیں جو زخم دل پر، وہ دیکھو — گریزاں گریزاں نظر کس لئے ہے

اسیری جب اپنا مقدّر ہی ٹھہری — قفس میں غمِ بال و پر کس لئے ہے

تلاش اے مرے چاند! تجھ کو ہے کس کی — تری چاندنی دربدر کس لئے ہے

چلے آیئے آپ دل میں ہمارے — ارے بندہ پرور! یہ گھر کس لئے ہے

اگر مَیں نہیں اُن کی محفل کے لائق — مرا ذِکر شام و سحر کس لئے ہے

ذرا آنسوؤں سے دُھلے فردِ عصیاں
نصیرؔ آپ کی چشمِ تر کس لئے ہے

◎

ہر اشارہ دشمنِ قلب و جگر لگنے لگا
حُسن والوں کی نظر سے مجھ کو ڈر لگنے لگا

جیسے دونوں میں ہو کوئی خاص وجہِ مُشترک
اَب تو مجھ کو آپ کا گھر اپنا گھر لگنے لگا

اِس نمائش گاہِ عالم کی نمائش دیکھ کر
ہر نظارہ ہم کو جادو کا اثر لگنے لگا

کم نہیں آمد سے تیری ، تیرے آنے کی خبر
آج قاصد کا بیاں بھی معتبر لگنے لگا

دیکھ کر صیّاد کو ، سکتے میں ہے مُرغِ چمن
بال و پَر ہوتے ہوئے ، بے بال و پر لگنے لگا

کُھل گیا ہے اپنی آنکھوں پر رفاقت کا سَراب
اب تو ہم کو اپنے سائے سے بھی ڈر لگنے لگا

جب جبینِ شوق نے دیکھا بہ چشمِ اعتقاد
سارا عالم ہی تُمھارا سنگِ در لگنے لگا

انتہائے درد نے فطرت بدل ڈالی نصیرؔ !
غم مجھے کب زہر لگتا تھا ، مگر لگنے لگا

◎

بڑھ چلی دیوانگی ، اپنے سے ہیں بیگانہ ہم
اُس نے کیا پھیریں نگاہیں بن گئے افسانہ ہم

یہ تو ہم جس کے ہیں وہ جانے کہ کیا ہیں کیا نہ ہم
کچھ اگر ہیں بھی تو بس خاکِ درِ جانانہ ہم

ٹھان لی ہے آج رندوں نے یہ اپنے دل میں بات
بزمِ ساقی میں پئیں گے آج بے پیمانہ ہم

گُل کِھلائے وحشتِ دل نے تو یہ عُقدہ کُھلا
وہ گلستاں تھا جسے سمجھا کیے ویرانہ ہم

بُھول جاتے ہیں جو اپنے عہد ، اپنے قول کو
ایسے لوگوں سے نہیں رکھتے کبھی یارانہ ہم

جن سے بس صاحب سلامت تھی ، اُنہیں اپنا لیا
غیر سب اپنے ہُوئے بس ایک ہیں بیگانہ ہم

اُن کی رسوائی کا ڈر اب پاؤں کی زنجیر ہے
جا نکلتے تھے کبھی اُن کی طرف روزانہ ہم

ٹوٹتا ہے نشہ ، اے پیرِ مغاں ! اک جام دے
پھر نہ یہ کہنا کہ تلپٹ کر گئے میخانہ ہم

مدّعا یہ تھا سُنائیں گے ہم اپنی داستاں
بے خودی میں کہہ گئے تجھ سے ترا افسانہ ہم

ہے ازل سے یہ تعلّق اُن کے جلووں سے نصیرؔ
لاکھ دُوری ہو ، مگر وہ شمع ہیں ، پروانہ ہم

کل نصیرؔ اک جام کا مِلنا ہمیں دشوار تھا
آج آنکھوں میں لیے بیٹھے ہیں اِک میخانہ ہم

تُو کہیں بدگماں نہ ہو جائے — جُستجو رائگاں نہ ہو جائے

مہرباں آسماں نہ ہو جائے — یہ "نہیں" تیری، "ہاں" نہ ہو جائے

عشق اُن کو بھی کر نہ دے مجھ سا — جو یہاں ہے، وہاں نہ ہو جائے

آج تم حرفِ مدّعا سُن لو — کل یہی داستاں نہ ہو جائے

فاصلے ہیں دلوں کا دُکھ، ظالم! — پھر کوئی درمیاں نہ ہو جائے

راستے منزلوں سے برگشتہ — گُم کہیں کارواں نہ ہو جائے

شرم سے یہ تری نگاہ کا تیر — کہیں جُھک کر کماں نہ ہو جائے

ہر کسی کو وفا کا ہے دعویٰ — دوستو! امتحاں نہ ہو جائے؟

جو مرا غم بتا سکے، وہ رہے — جو مرا رازداں نہ ہو "جائے"

کیوں رہے دل کی بات دل میں نصیرؔ!

آنسوؤں سے بیاں نہ ہو جائے؟

جس طرف آپ کے پیکانِ نظر جاتے ہیں

اُس طرف لوگ لئے قلب و جگر جاتے ہیں

جانے کیا دل میں خیالات گزر جاتے ہیں

بیٹھے بیٹھے وہ جھجک اُٹھتے ہیں، ڈر جاتے ہیں

ہم کو معلوم ہے اُس بزم میں کیا کچھ ہو گا

آزمانے کو نصیب آج مگر "جاتے ہیں"

کُوئے قاتل میں جو دل جائے تو ہے شُکر کی جا

اِس میں عُشّاق جب آتے ہیں تو "سَر جاتے ہیں"

اِک تبسّم کی تمنّا میں جو آئے تھے یہاں

وہ تری بزم سے بادیدۂ تر جاتے ہیں

اُن کے اظہارِ کرم میں یہ ستم کا انداز

اُٹھ کے پہلو سے مرے، غیر کے گھر جاتے ہیں

یہ ضروری نہیں تجھ کو ہی نظر سے دیکھیں
مَرنے والے تری تصویر پہ مر جاتے ہیں

کیا عجب ہے، ترے دل تک بھی تپش آتی ہو
تا ثریّا مری آہوں کے شرر جاتے ہیں

ہم تو جینے کے لئے مرتے ہیں اُن پر ہر دم
جن کو جینا نہیں آتا ہے، وہ مر جاتے ہیں

مَیں تو مَیں، رشک میں اوروں کا بُرا حال ہُوا
داغ سے دل پہ لئے، شمس و قمر جاتے ہیں

خون کے اشک نہ روئے تو کرے کیا کوئی
سامنے سے وہ مرے ہنس کے گزر جاتے ہیں

اُن کے جلووں سے نگاہیں مری روشن ہیں نصیرؔ!
آنکھ کی راہ سے جو دل میں اُتر جاتے ہیں

◎

دُعائے وصل اک پندار بھی ہے — کہ اپنی جیت اُن کی ہار بھی ہے

خوشی بھی ہے، غمِ دشوار بھی ہے — محبّت پھول بھی ہے، خار بھی ہے

"نہیں" کہہ کر نگاہیں جھک گئی ہیں — ترے انکار میں اقرار بھی ہے

شریکِ فتنۂ روزِ قیامت — مری زنجیر کی جھنکار بھی ہے

جہانِ زندگی ہے اک مُعمّا — بشر مجبور بھی، مختار بھی ہے

ازل سے عشق و حُسن اب تک بہم ہیں — جہاں دل ہے، وہاں دلدار بھی ہے

تمنّائے تجلّی حق بجانب — میسّر، دیدۂ بیدار بھی ہے؟

بساطِ عشق کی ہر چال اُلٹی — کہ جو کچھ جیت ہے وہ ہار بھی ہے

اِدھر بھی اک عنایت کی نظر ہو
تمنّائی نصیرِؔ زار بھی ہے

◎

سنگ در دست بھی دوچار تو مل جاتے ہیں
سر میں سودا ہو ، خریدار تو مل جاتے ہیں

پھول کے روپ میں کچھ خار تو مل جاتے ہیں
صرف کہنے کے لئے یار تو مل جاتے ہیں

زلفِ پُرپیچ سے دم سادھ رہی ہے دنیا
عاشقانِ لب و رخسار تو مل جاتے ہیں

خوب رُو تم سا زمانے میں نہ دیکھا ، نہ سنا
اور بھی ورنہ طرح دار تو مل جاتے ہیں

میرے مطلب کی فضائیں نہ سہی گلشن میں
شبنم و گُل کے کچھ آثار تو مل جاتے ہیں

آپ سے اب ہمیں کچھ اور ملے یا نہ ملے
یہی کیا کم ہے کہ سرکار تو مل جاتے ہیں

دوسرا کوئی طریقہ نہیں دل ملنے کا
ہاں جو آپس میں رہے پیار ، تو مل جاتے ہیں

تیری باتوں میں نہ شوخی ، نہ حرارت ، واعظ!
سرد الفاظ کے طُومار تو مل جاتے ہیں

کبھی بچھڑے ہوئے دو دِل نہیں ملتے ، لیکن
ساتھ دے وقت کی رفتار ، تو مل جاتے ہیں

بندشیں گردشِ دوراں کی بہرگام سہی
ملنے والے جو ہوں تیّار ، تو مل جاتے ہیں

اور کچھ ہم میں نصیر اہلِ جہاں کو نہ ملے
کم سے کم فقر کے آثار تو مل جاتے ہیں

اک قدم حلقۂ وحشت سے نکالا نہ گیا
دشت میں جان گئی ، پاؤں کا چھالا نہ گیا

آ کے بیٹھا تو نہ اُٹھا وہ تری محفل سے
پھر کہیں اور ترا چاہنے والا نہ گیا

میرا دل تھا مرے پہلو میں حفاظت سے ، مگر
آئنہ لے تو لیا تم نے ، سنبھالا نہ گیا

جان پیاری تھی ، مگر جان سے پیارے تم تھے
جو کہا تم نے وہ مانا گیا ، ٹالا نہ گیا

یہ بھی اُس زُلفِ گرہ گیر کا نکلا ہمسر
کوئی بھی پیچ مقدر کا نکالا نہ گیا

صرف اک بار ہی دیکھا تھا نظر بھر کے اُنہیں
زندگی بھر مری آنکھوں کا اُجالا نہ گیا

خاک میں مِل گئے سب گوہرِ صد رنگ نصیرؔ
تجھ سے دامن پہ کوئی اشک سنبھالا نہ گیا

اشکوں سے فضا بِھگو گئے ہم
ٹھنڈک جو مِلی تو سو گئے ہم

آغوشِ لحد میں تو گئے ہم
دنیا کے حواس کھو گئے ہم

مانا کہ تری خطا نہیں ہے
برباد یہ کیسے ہو گئے ہم

ہو کُنجِ قفس کہ سایۂ گُل
نیند آئی جہاں بھی ، سو گئے ہم

پلکوں پہ چمک رہے ہیں آنسو
موتی یہ عجب پِرو گئے ہم

کاٹے گا کوئی تو فصل آ کر
اخلاص کا بیج بو گئے ہم

جاتے نہ کبھی اُس انجمن میں
یاد اُس نے کیا ہے تو ، گئے ہم

آخر وہ چمن کے کام آئے
آنسو جو لہو کے رو گئے ہم

کس بات پہ تم تڑپ اُٹھے ہو
کانٹا تو نہیں چبھو گئے ہم

بلوایا تھا بزم میں ، تو آئے
کہتے ہو کہ جاؤ ، لو ! گئے ہم

قسمت کے نصیرؔ کھیل دیکھو
پایا جو اُنہیں ، تو کھو گئے ہم

◎

کسی کے حُسن پہ دل کو گنوا کے بیٹھا ہوں
حواس و ہوش کی دنیا لُٹا کے بیٹھا ہوں

بُتوں کی بزم کو کعبہ بنا کے بیٹھا ہوں
خدا گواہ! کہ گھر میں خدا کے بیٹھا ہوں

کچھ اِس ادا سے گلستاں میں آ کے بیٹھا ہوں
گلوں کی چاہ میں خود کو لُٹا کے بیٹھا ہوں

خبر نہیں کہ مرا حال کیا ، مآل ہو کیا
ابھی تو آپ کی محفل میں آ کے بیٹھا ہوں

پھر آپ جام لیے آرہے ہیں میری طرف
جنابِ شیخ! ابھی تو پلا کے بیٹھا ہوں

اب اُن کی بزم کے دستور کیا بتاؤں مَیں
کبھی نہ اُن سے مِلا ہوں ، نہ جا کے بیٹھا ہوں

بھٹک نہ جائیں اندھیرے میں وہ شبِ وعدہ
چراغ راہ میں اُن کی جلا کے بیٹھا ہوں

اُنھیں نہ میری کوئی فکر ہے نہ میرا خیال
وہ جن کے واسطے سب کچھ لُٹا کے بیٹھا ہوں

زمین پر نظر آتا ہے سرنگوں کیا کیا
نصیؔر! چرخ کو نیچا دِکھا کے بیٹھا ہوں

◎

کتنے سفّاک مرے دل کے یہ مہماں نکلے

خُون پی کر ہی ترے تیر کے پیکاں، نکلے

عشق میں جینے کا ممکن نہیں امکاں نکلے

دل دیا اُس کو، کہ دیکھے سے جسے جاں نکلے

سر پہ الزام لیا ، اشک بداماں نکلے

خُلد سے تھام کے دل حضرتِ انساں نکلے

مجھ کو خود اپنی تباہی پہ بڑا رشک آیا

وہ مرے حال پہ اِس درجہ پشیماں نکلے

اُن سے ملنے کا کسی روز نہ ارماں نکلا

عُمر گزری اِسی ارماں میں، کہ ارماں نکلے

دل اُداس، آپ خفا ، اور مقدّر ناخوش

کون ایسے میں پئے سیرِ گلستاں نکلے

آپ سے لُطف وکرم کی بڑی اُمّیدیں تھیں

آپ بھی میرے لئے فتنۂ دوراں نکلے

بےخودیِ دل کی مجھے لے کے جہاں پہنچی ہے

کاش ! منزل وہ مری کوچۂ جاناں نکلے

بے خُودی میں نہ ہُوئی ہم کو نصیر اپنی خبر

ہوش آیا تو ہمیں جلوۂ جاناں نکلے

◎

جب اُن سے مری پہلی ملاقات ہوئی تھی
اُس دن ہی قیامت کی شروعات ہوئی تھی

اِتنا ہے مجھے یاد ، کبھی بات ہوئی تھی
رسمًا ہی سہی ، اُن سے ملاقات ہوئی تھی

خط پڑھ کے خفا تو ہُوا ، اور اُس نے کہا کیا؟
قاصد! مرے بارے میں کوئی بات ہوئی تھی؟

کچھ یاد نہیں بازیِ اُلفت کا نتیجہ
تم جیت گئے تھے کہ ہمیں مات ہوئی تھی

میں ہُوں وہ رہِ عشق میں مظلوم مسافر
منزل کے قریب آ کے جسے رات ہوئی تھی

ہاں یاد ہے مجھ کو تری زلفوں کا بکھرنا
برسا تھا یہ بادل ، کبھی برسات ہوئی تھی

محروم ہُوں اب خواب میں بھی اُس کی جھلک سے
جس در کی زیارت مجھے دن رات ہوئی تھی

یہ چاند یہ تارے بھی بتاتے ہیں چمک کر
تقسیم ترے حُسن کی خیرات ہوئی تھی

بیٹھے تھے سرِ بزم نصیرؔ اُن کے قریں ہم
کل رات کی یہ بات ہے ، کل رات ہوئی تھی

◎

ہزاروں بار تیری انجمن میں، مَیں گیا آیا
کبھی تُو بھی یہ کہہ دے میرا دل چاہا چلا آیا

مِلا کر خاک میں مجھ کو، بتاؤ کیا مزا آیا
تمہیں کیا مل گیا آخر، تُمہارے ہاتھ کیا آیا

جو آیا بھی اُسے تو صرف اندازِ جفا آیا
وفا کی راہ پر کب وہ وفا ناآشنا آیا

وہ چونکے، مجھ کو دیکھا، اور ماتھے پر شکن آئی
مرے غم کے فسانے میں جہاں ذکرِ وفا آیا

اُنہیں لکھا ہے خط مَیں نے، نتیجہ دیکھیے کیا ہو
مرے قاصد کا دعویٰ ہے کہ بس مَیں اب گیا "آیا"

نہیں تھے وہ، تو میخانہ تھا سُونا، جام ویراں تھے
وہ آ پہنچے تو پھر پینے پلانے کا مزا آیا

یہ کہہ کہہ کر پلا دی مجھ کو میخانے میں ساقی نے
اَرے اب پی بھی لے، ایسا کہاں کا پارسا آیا

نظر سے دُور ہو جاؤ، چلو، اُٹھو، ہوا کھاؤ
نصیرؔ اُن کی طرف سے یہ جوابِ مدّعا آیا

◎

کس تصوّر میں وہ کھو جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے
اپنے جی میں آپ شرماتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

پاس رہ کر جو ستم ڈھاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے
جب چلے جائیں، تو یاد آتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

یوں ہم اپنے دل کو بہلاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے
کوئے جاناں تک پہنچ جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

اب تو وہ رہنے لگے ہر وقت مجھ سے بدگماں
ہو بُرا اُن کا، جو بھڑکاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

فصلِ گُل کیا آئی ہے، دیوارِ زنداں سے اسیر
رات دن سر اپنا ٹکراتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

ہے غنیمت چند لمحوں کے لیے مِل بیٹھنا
دوست دنیا میں بچھڑ جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

کس کو یارائے سخن، کس کو مجالِ گفتگو
آپ جب خنجر ہی لہراتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

میرے دل کی اُلجھنوں کا بھی کبھی کوئی خیال
زُلف تو وہ اپنی سلجھاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

چشمِ حق آگاہ میں کیا قدر و قیمت اُن کی ہو
چند سِکّوں پر جو اِتراتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

آئنہ ہے، اور وہ ہیں، اور میرا دل نصیرؔ
اُن کی بن آئی ہے، تڑپاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

◎

لاکھ ڈھونڈا مگر نہیں ملتا
کوئی بھی ہم سفر نہیں ملتا

ہو نظر تو کدھر نہیں ملتا
وہ کہاں جلوہ گر نہیں ملتا

وہ بڑا بدنصیب ہے جس کو
آپ کا سنگِ در نہیں ملتا

ہم بھی اُس سے کبھی نہیں ملتے
ہم سے کوئی اگر نہیں ملتا

کھو گیا ہو جو راہِ اُلفت میں
وہ کہیں عمر بھر نہیں ملتا

گھر سے نکلے تو وہ نہ آیا ہاتھ
اب جو پلٹے تو گھر نہیں ملتا

عشق میں ترکِ جُستجو ہے حرام
نہ ملے وہ، اگر نہیں ملتا

ہم نہ بُھولے سے بھی اُسے بُھولے
جو ہمیں بُھول کر نہیں ملتا

ہائے مُرغِ چمن کی تاراجی
دُور تک کوئی پر نہیں ملتا

اُس کو چل پھر کے ڈھونڈنے والو!
وہ سرِ رہگزر نہیں ملتا

کس سے اَسرارِ معرفت کہیئے
کوئی بالغ نظر نہیں ملتا

جُستجو ہو اگر ٹھکانے کی
کون کہتا ہے، گھر نہیں ملتا

جلوۂ ذات سے جو خالی ہو
کوئی ایسا بشر نہیں ملتا

غم کی برسات میں سُنا ہے نصیرؔ!
چاکِ زخمِ جگر نہیں "ملتا"

◎

خزاں جو آئی، بہاروں کا حال کیا ہو گا
نظر نواز نظاروں کا حال کیا ہو گا

نکل گئے ہیں ترے شہر سے ضرور، مگر
ترے فریب کے ماروں کا حال کیا ہو گا

تمہاری مانگ کی افشاں پہ پڑ گئی جو نظر
کوئی بتائے، ستاروں کا حال کیا ہو گا

حریمِ ناز میں جا کر جو بیٹھ جاؤ گے
تمہارے سجدہ گزاروں کا حال کیا ہو گا

گُلوں کے چاکِ گریباں کو دیکھ، اور نہ پُوچھ
کہ اُن کے سینہ فگاروں کا حال کیا ہو گا

خرامِ ناز سے مطلب، تری بَلا جانے
کہ ہم شکستہ مزاروں کا حال کیا ہو گا

تمہارے ہوتے کلی چُپ ہے، گُل گریباں چاک
تمہارے بعد بہاروں کا حال کیا ہو گا

وہ موج، جس سے سفینوں کے دل لرزتے ہیں
بپھر گئی، تو کناروں کا حال کیا ہو گا

کِھلا ہے غنچۂ دل، نیم باز آنکھوں سے
تری نظر کے اشاروں کا حال کیا ہو گا

کسی کو سامنے اُس کے نہیں مجالِ سخن
نصیرؔ! حشر میں یاروں کا حال کیا ہو گا

◎

بہت کچھ ہم نے دیکھا، دیکھنے کو
رہا دنیا میں اب کیا دیکھنے کو

مَیں خود اک قدِ آدم آئنہ ہُوں
ترا اپنا سراپا دیکھنے کو

کہاں ساحل پہ موجوں کا تبسّم
اُنھیں آتا ہے دریا دیکھنے کو

نکل آئے فلک پر چاند سُورج
ترا نقشِ کفِ پا دیکھنے کو

دمِ آخر کروں گا راز اِفشا
مجھے آپ آئیں تنہا دیکھنے کو

مریضِ غم کا مَنکا ڈھل چکا ہے
چلو، اب رہ گیا کیا دیکھنے کو

تجھے دیکھے نہ کیوں سارا زمانہ
کہاں مِلتا ہے تجھ سا دیکھنے کو

مجھے اُٹھ اُٹھ کے سب محفل نے دیکھا
وہی ظالم نہ اُٹّھا دیکھنے کو

حریمِ ناز سے باہر وہ آئیں
کھڑی ہے ایک دنیا دیکھنے کو

ترا ثانی سُنا ہم نے، نہ دیکھا
زمانہ ہم نے دیکھا، دیکھنے کو

بس اِس کے بعد تو راہِ عدم ہے
یہی باقی ہے رَستا دیکھنے کو

اِدھر دَم دے دیا بیمارِ غم نے
اُدھر آیا مسیحا دیکھنے کو

نصیرؔ! اُن کی گلی میں کیوں گئے تھے
یہی، اپنا تماشا دیکھنے کو؟

◎

گُل و شبنم کے رُوپ میں ہوتے
مسکراتے جو آپ ، ہم روتے

عمر گزری ہے رات دن روتے
داغِ دل اور کس طرح دھوتے

تم مرے پاس جب نہیں ہوتے
یاد کرتا ہوں جاگتے سوتے

عالَمِ نزع دیکھنے کا تھا
کاش ایسے میں آپ بھی ہوتے

بس اِسی ڈر سے کی پسند وفا
کاٹنا تھا وہی ، جو ہم بوتے

عشق نے رہنمائی کی ، ورنہ
ہم کہیں ، اور وہ کہیں ہوتے

دل کو یُوں اُس نگاہ نے چھیڑا
میری آنکھوں کے کُھل گئے "سوتے"

بے وفا تو کسی کو ہونا تھا
تُم نہ ہوتے اگر ، تو ہم ہوتے

جو کرے وہ بَھرے، مَثَل یُوں ہے
غیر کے ہم گناہ کیوں ڈھوتے

اُن کے دَم سے ہے عاشقی کا وجود
وہ نہ ہوتے ، تو ہم کہاں ہوتے

ہجر کی شب کہاں قرار، نصیرؔ !
چین کی نیند کس طرح سوتے

◎

سب پہ اُحسان ہے ساقی ترے میخانے کا
نشّہ ہر رِند کو ہے ایک ہی پیمانے کا

لطف کر، ظلم سے قابُو میں نہیں آنے کا
لوگ دیکھیں نہ تماشا ترے دیوانے کا

مدعا کس پہ عیاں ہو مِرے افسانے کا
راز ہوں مَیں ، نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

تابشِ حُسن سے یہ رنگ ہے میخانے کا
دل دھڑکتا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

چشمِ ساقی ہے اُدھر اور مرا دل ہے اِدھر
آج ٹکراؤ ہے پیمانے سے پیمانے کا

اپنی ہی آگ میں جلنے کا مزا ہے کچھ اور
حوصلہ شمع سے بڑھ کر نہیں پروانے کا

واعظِ شہر نے کیوں بیعتِ ساقی کر لی
اُس نے تو عہد کیا تھا مجھے بہکانے کا

زاہد و رِند میں ایسی کوئی دوری تو نہیں
فاصلہ ہے، تو چھلکتے ہوئے پیمانے کا

بات بے بات اُٹھا دیتا ہے اِک چھیڑ نئی
پڑ گیا ہے اُسے چسکا مجھے تڑپانے کا

بات کہتا ہے کچھ ایسی کہ نہ سمجھے کوئی
یہ بھی اک غور طلب رنگ ہے دیوانے کا

شیخ صاحب کبھی اپنوں کی طرح آ کے پئیں
مرتبہ غیر پہ کُھلتا نہیں میخانے کا

پیرِ میخانہ ! تری ایک نظر کافی ہے
مَیں طلب گار نہ شیشے کا نہ پیمانے کا

چشمِ ساقی کی توجّہ تھی، کہ آڑے آئی
قصد واعظ نے کیا تھا مجھے بہکانے کا

ایک دو جام سے کیا پیاس بُجھے گی ساقی !
سلسلہ ٹوٹ نہ جائے کہیں پیمانے کا

وہ بہار آئی نصیرؔ اور وہ اُٹھے بادل
بات ساغر کی چلے، ذکر ہو میخانے کا

◎

رقصِ بسمل کے مناظر بھی ہیں کیا کیا "دیکھیں"
دل بہل جائے گا دیکھیں، وہ تماشا دیکھیں

ہنستے دیکھا ہے جسے کل، اُسے روتا دیکھیں
آج اُٹھتا ہُوا خوشیوں کا جنازا دیکھیں

نور و ظلمت کی دو رنگی کے تماشے ہیں بہت
ہم نمائش گہِ ایجاد میں کیا کیا دیکھیں

میری وارفتگیِ شوق پہ تنقید بجا
آج تک آپ نے اُس کو نہیں دیکھا، "دیکھیں"

آپ کے ساتھ عیادت کو نہ آئے کوئی
آپ بیمارِ غمِ عشق کو تنہا دیکھیں

اپنی آنکھوں میں ہے اک غیرتِ یوسف کا جمال
دیکھ کر اُس کو کسی اور کو اب کیا دیکھیں

میں تو اک پیکرِ ناچیز ہُوں سرتا بہ قدم
مجھ کو کیا دیکھنا ، آپ اپنا سراپا دیکھیں
آپ تو اپنے ہی پندار کے زندانی ہیں
آپ دنیا سے بہت دُور ہیں ، دنیا دیکھیں
ایک مدّت سے نصیؔر اُن کے تمنّائی تھے
وقت آیا ہے کہ انجامِ تمنّا دیکھیں

◎

کبھی پیکاں کبھی خنجر ، نظر یوں بھی ہے اور یوں بھی
وہ قاتل درپئے قلب و جگر یوں بھی ہے اور یوں بھی
گُلوں میں رنگ بن کر ، چاند تاروں میں چمک بن کر
ہمارے سامنے وہ جلوہ گر یوں بھی ہے اور یوں بھی
نگاہیں پھیر لے یا مسکرا کر دیکھ اے ظالم !
ستم ہو یا کرم ، تُو معتبر یوں بھی ہے اور یوں بھی
کوئی رحمت سمجھتا ہے ، کوئی زحمت سمجھتا ہے
حسینوں پر زمانے کی نظر یوں بھی ہے اور یوں بھی
لکھا ہم نے مفصّل خط ، بتایا ایک دنیا نے
ہمارے حال کی اُن کو خبر یوں بھی ہے اور یوں بھی
نویدِ وصل ہو ، یا عذر ہو وعدہ خلافی کا
دلوں پر اُن کی باتوں کا اثر یوں بھی ہے اور یوں بھی

حیات و موت دونوں کی حقیقت ایک ہی کہیۓ
مسافر کے لئے شکلِ سفر یوں بھی ہے اور یوں بھی

بُلائیں ہم اُنہیں، یا خود وہ آئیں، اختیار اُن کو
ہمارا خانۂ دل اُن کا گھر یوں بھی ہے اور یوں بھی

کبھی بہلا دیا مجھ کو، کبھی سرمستیاں دے دِیں
مرے ساقی کا اندازِ نظر یوں بھی ہے اور یوں بھی

نصیرؔ اُس کا ٹھکانا ہے نہ صحرا میں نہ گلشن میں
جو اُن کے دَر سے اُٹھا، دربدر یوں بھی ہے اور یوں بھی

◎

کوئی اِس دشتِ وفا میں نہ چلا میرے بعد
ذرّے ذرّے پہ مِرا نقش رہا میرے بعد

یوں نہ پھر ہو گا کوئی نغمہ سرا میرے بعد
اور ہی ہو گی گلستاں کی ہَوا میرے بعد

اِس طرح کون اسیرِ خمِ کاکُل ہو گا
کس کو راس آئے گی زنداں کی فضا میرے بعد

پھر نہ پابندِ وفا ہو گا کوئی مجھ جیسا
رکھّے رہ جائیں گے آدابِ وفا میرے بعد

مَیں نے تو زہر بھرے جام محبّت میں پیٔے
دیکھیۓ کس کو شرف ہو یہ عطا میرے بعد

دستِ رنگیں پہ ترے کس کا لہو چمکے گا
رنگ لانے سے رہا، رنگِ حنا میرے بعد

چشم و ابرو کے اشارات کُھلیں گے کس پر
کون سمجھے گا یہ غمزہ ، یہ ادا میرے بعد

راہ سُنسان ، مکاں خستہ ، مکیں افسردہ
کیسا ویران ہُوا شہرِ وفا میرے بعد

مجھ سا کوئی بھی نہیں تیرے وفاداروں میں
اُڑ کے رہ جائے گا یہ رنگِ وفا میرے بعد

مَیں ہی اک واقفِ آدابِ محبّت ہُوں نصیرؔ
مِل کے ڈھونڈیں گے مجھے اہلِ وفا میرے بعد

قسمت سے جو اُن کا رُخِ تاباں نظر آئے
کیوں وجد کے عالم میں نہ انساں نظر آئے

عارض ترے ، بالائے زنخداں نظر آئے
اِک رِحل پہ دو دو ہمیں قرآں نظر آئے

آئینہ بہ کف ، جلوہ بداماں نظر آئے
ذرّے جو قریبِ درِ جاناں نظر آئے

ظاہر میں جو خاموش سے اِنساں نظر آئے
باطن میں وہی فتنۂ دوراں نظر آئے

کچھ ایسے بھی اِس دَور میں انساں نظر آئے
کیا کچھ تھے ، مگر بے سروساماں نظر آئے

ممکن ہے توجّہ بھی ، نوازش بھی ، کرم بھی
اُن سے کوئی ملنے کا تو امکاں نظر آئے

فرقت میں جو سائے کی طرح ساتھ رہے ہیں
قُربت میں وہی لمحے گریزاں نظر آئے

قسمت مری برگشتہ ہے، وحشت مری فطرت
گُلشن کو بھی دیکھوں تو بیاباں نظر آئے

بڑھ بڑھ کے بہاروں نے قدم چُوم لیے ہیں
جس راہ گزر میں وہ خراماں نظر آئے

اللہ کرے تُو نظر آئے نہ پریشاں
آئے تو تری زُلف پریشاں نظر آئے

وہ شوخ جب آیا تو پھر اِس شان سے آیا
جو صاحبِ خانہ تھے، وہ مہماں نظر آئے

کل تک نہ قدم گھر سے نکالا تھا جنھوں نے
دَر دَر پہ نصیرؔ آج وہ انساں نظر آئے

◎

ذرا دل میں گداز آیا نہیں ہے — جفاؤں سے وہ باز آیا نہیں ہے
رہیں سب کی نگاہیں آئنوں تک — نظر آئینہ ساز آیا نہیں ہے
مقدر میں مرے خَم آئے، لیکن — خمِ زلفِ دراز آیا نہیں ہے
بجز میرے، تمھاری انجمن میں — کوئی دانائے راز آیا نہیں ہے
پگھل کر جس سے دل ہو جائے پانی — نفَس میں وہ گداز آیا نہیں ہے
ابھی محفل میں ہیں خوابیدہ فتنے — ابھی وہ فتنہ ساز آیا نہیں ہے
پرکھ سکتے نہیں وہ دوست دشمن — شعورِ امتیاز آیا نہیں ہے

نصیرؔ اُس انجمن میں کیا ہو رونق
جہاں وہ سروِ ناز آیا نہیں ہے

◎

کئی پہنچے ترے دَر تک ، کئی دیوار تک پہنچے
بس اِک ہم تھے کہ تیری جستجو میں دار تک پہنچے

تماشا بن گئے ، سُولی چڑھے ، تلوار تک پہنچے
پہنچنے والے لیکن جلوہ گاہِ یار تک پہنچے

حسینوں کے یہاں اِنکار ہے اقرار سے پہلے
نہیں کی رَمز جو سمجھے ، وہ خُوئے یار تک پہنچے

مقدّر پر ہمیں غیروں کے اکثر رشک آتا ہے
کہ ہم دَر تک نہ پہنچے اور وہ دربار تک پہنچے

مسیحا بن گئے ، لیکن مسیحائی بھی کی تم نے ؟
کبھی بیمار کو پوچھا ؟ کبھی بیمار تک پہنچے ؟

اذیّت آشنا ہونا پڑا یوں دشتِ ہستی میں
مرے تلووں کے چھالے بڑھ کے نوکِ خار تک پہنچے

جنابِ شیخ نے پیمانہ رَد کرنا نہیں سیکھا
ہزاروں بار یہ توبہ سے استغفار تک پہنچے

سُنا جب یہ کہ اُن کی گفتگو موتی لُٹاتی ہے
بھکاری بن کے ہم بھی اُس دَرِ دُربار تک پہنچے

کبھی نامہ لکھا تو خود ہی لکھ کر ، چاک کر ڈالا
کہاں کا نامہ بَر ، کیوں کوئی میرے یار تک پہنچے

نرالی چال دیوانوں کی تھی .راہِ تمنّا میں
چلے ، چل کے رُکے ، رُک کر چلے ، دلدار تک پہنچے

نصیؔر! ایسا نہ ہو دشتِ وفا کی دُھوپ سے ڈر کر
محبّت سَر چُھپانے ، سایۂ دیوار تک پہنچے

◎

نظر اُٹھی جدھر بھی، ہم نے اُن کو جلوہ گر دیکھا
بہ قلبِ مطمئن دیکھا ، بہ چشمِ معتبر دیکھا

نہ ہم کو دیکھ لے کوئی یہ اطمینان کر دیکھا
اُنہیں دیکھا، مگر پہلے اِدھر دیکھا ، اُدھر دیکھا

ستم جھیلے ، سمیٹے غم ، لگا دی جان کی بازی
جو ہم سے ہو سکا راہِ وفا میں ہم نے کر دیکھا

وہی ہوں جلوہ ساماں جس طرف واعظ! نظر اُٹھے
اُنہیں کو جب نہیں دیکھا تو پھر کیا اپنا سر دیکھا

عجب سودا ہے بازارِ جہاں میں دل کا سودا بھی
منافع کم نظر آیا ، خسارا بیشتر دیکھا

ہماری وحشتِ دل کی نہ پُوچھے داستاں کوئی
گئے ہیں بعد میں صحرا کی جانب ، پہلے گھر دیکھا

ہمیشہ احترامِ جلوہ میں جُھکتی رہیں آنکھیں
کبھی ہم نے نظر بھر کر نہ اُن کو عُمر بھر دیکھا

جو کل تک دُور تھے ، وہ آج اپنے پاس بیٹھے ہیں
نصیرؔ! اخلاص کی باتوں کا ہم نے یہ اثر دیکھا

◎

ڈر گیا ، اور کانپ کانپ گیا — مَیں کسی کی نظر کو بھانپ گیا

ہجر میں یہ نَفَس کی آمد و شُد — ایک سانپ آیا، ایک سانپ گیا

غنچہ و گُل کا دیکھ کر انجام — دل گلستاں میں کانپ کانپ گیا

بے کفن لاش تھی مسافر کی — آ کے طوفانِ گرد ، ڈھانپ گیا

جس کو کل آستیں میں پالا تھا — آج ڈس کر مجھے وہ سانپ "گیا"

میرے اُن کے معاملات کا رُخ — اک نظر میں زمانہ بھانپ گیا

وہ ستم ڈھائے آپ نے مجھ پر — قلبِ کوہِ گراں بھی کانپ گیا

اپنے دشمن کو اب تو پہچانیں — دیکھیے دیکھیے ، وہ سانپ گیا

عرصۂ شوق میں نصیرؔ اکثر
اِتنا دَوڑا ہُوں مَیں، کہ ہانپ گیا

◎

دیر سے ترسے ہُوئے ہیں ایک پیمانے کو ہم
کیا عجب اک گھونٹ میں پی جائیں میخانے کو ہم

کیا محبّت میں سُنائیں اپنے افسانے کو ہم
چین سے جینے کو وہ ، دُکھ سہ کے مر جانے کو ہم

اپنے جلووں سے ہمیں حیراں بناتے جایئے
آئے ہیں اِس بزم میں آئینہ بن جانے کو ہم

اُٹھ گئے یارانِ محفل ، مٹ گئیں دلچسپیاں
رہ گئے ماضی کا ہر افسانہ دُہرانے کو ہم

جو زباں سے بات کہنی تھی ، نگاہوں نے کہی
شرحِ اجمالِ کرم کہتے ہیں ، شرمانے کو ہم

وحشتِ دل کے مطابق وسعتِ صحرا کہاں
کیا نظر میں لائیں ایسے ویسے ویرانے کو ہم

تم تو کچھ سُننے سے پہلے ہی خفا ہونے لگے
وہ تو آئے تھے فقط اک بات سمجھانے کو ہم

ہم نباہیں دوستی ، وہ دِشمنی کرتے رہیں
بھاڑ میں ڈالیں اُٹھا کر ایسے یارانے کو ہم

دل مٹا ، ایماں گیا ، رُسوا ہُوئے ، باتیں سُنیں
آئے تھے کیا آپ کی محفل میں لُٹ جانے کو ہم ؟

کس ادا سے کہہ رہے ہیں وہ مرے اصرار پر
رُک نہیں سکتے ، مگر آجائیں گے آنے کو ہم

دل پھر اپنا دل ہے ، یہ دھڑکن عذابِ جاں سہی
اپنے پہلو میں لیے بیٹھے ہیں دیوانے کو ہم

لے اُڑیں صحرا کی جانب وحشتوں کی آندھیاں
گھر سے نکلے تھے گلستاں کی طرف جانے کو ہم

خیر سے ہم نے بھی دیکھی ہے بہت دنیا نصیرؔ !
جانتے پہچانتے ہیں اپنے ، بیگانے کو ہم

◎

عہد پُختہ کیا رندوں نے یہ پیمانے سے
خاک ہو جائیں گے ، نکلیں گے نہ میخانے سے

میرے ساقی ! ہو عطا مجھ کو بھی پیمانے سے
فیض پاتا ہے زمانہ ترے میخانے سے

یک بہ یک اور بھڑک اُٹھتا ہے سمجھانے سے
کوئی کیا بات کرے آپ کے دیوانے سے

رِند مِل مِل کے گلے روئے تھے پیمانے سے
جب مری لاش اُٹھائی گئی میخانے سے

ہم تو کیا پیتے پلاتے سرِ میخانہ ، مگر
دل لگی ہوتی رہی پھُول سے ، پیمانے سے

مجھ سے پوچھے کوئی ، کیا مجھ پہ جنوں میں گزری
قیس و فرہاد کے قصّے تو ہیں افسانے "سے"

واعظِ شہر کی توبہ نہ کہیں ٹُوٹی ہو
آج ہُو حق کی صدا آتی ہے میخانے سے

کون یہ آگ لگا دیتا ہے ، معلوم نہیں
روز اُٹھتا ہے دُھواں سا مِرے کاشانے سے

ترکِ ثابت قدمی ایک قیامت ہو گی
اور گھر جاؤ گے آلام میں ، گھبرانے سے

پا لیا آپ کو ، اقرارِ محبت نہ کریں
بن گئی بات مری ، آپ کے شرمانے سے

رِند کے ظرف پہ ساقی کی نظر رہتی ہے
اِسے چُلّو سے پلا دی ، اُسے پیمانے سے

شیخ کے ساتھ یہ رِندوں پہ قیامت ٹُوٹی
پینے والے بھی نکالے گئے میخانے سے

باغباں ! پُھونک ، مگر شرط یہ ہے گُلشن میں
آگ پھولوں پہ نہ برسے مرے خَسخانے سے

اِس سے بہتر نہ ملے فرشِ سکینت شاید
ہم پکاریں گے اُنہیں بیٹھ کے ویرانے سے

بات سُنتے جو نصیرؔ آپ ، تو اِک بات بھی تھی
بات سُنتے نہیں ، کیا فائدہ سمجھانے سے

◎

تجدیدِ حیات ہو گئی ہے — اُن سے مری بات ہو گئی ہے

فطرت ہوئی خودشناس جب سے — آئینۂ ذات ہو گئی ہے

انساں ! تری اِن سہولتوں سے — دشوار حیات ہو گئی ہے

آیا ہے شباب جب سے اُن پر — کچھ اور ہی بات ہو گئی ہے

اُلٹی ہی پڑیں جفا کی چالیں — اکثر اُنہیں مات ہو گئی ہے

دل جب سے نہیں رہا ہمارا — ہر غم سے نجات ہو گئی ہے

بڑھنے لگے گیسوؤں کے سائے — لگتا ہے کہ رات ہو گئی ہے

اب تیرِ نظر نہ آزماؤ — ناکام یہ گھات ہو گئی ہے

وہ لَوٹ کے پھر اِدھر نہ آئے — شاید کوئی بات ہو گئی ہے

رُودادِ ستم نصیرؔ ! کب تک
سو جاؤ کہ رات ہو گئی ہے

◎

نہ اُٹھے حجاب سارے، مرے اُن کے درمیاں سے
کبھی کچھ کہا نظر سے، کبھی کچھ کہا زباں سے

ہُوئیں بارشیں کرم کی، اُسی وقت آسماں سے
جو لپٹ کے رو دیئے ہم ترے سنگِ آستاں سے

جو بیاں ہو اُن سے قاصد! تو ذرا سنبھل سنبھل کر
اُنہیں اضطراب ہو گا، مرے غم کی داستاں سے

یہ فریب ہے مثالی، کہ ہیں دونوں ہاتھ خالی
مجھے مِل سکا نہ کچھ بھی، مری عُمرِ رائگاں سے

کسے صبر کا ہو یارا کہ اُلٹ چلی ہے قسمت
نظر آرہے ہیں اب تو، مجھے وہ بھی بدگماں "سے"

مجھے ساتھ ساتھ رکھّا اِسی دن کے واسطے کیا؟
نہ چُھڑائیں اب وہ دامن، مرے دستِ ناتواں سے

کہیں بن نہ جائیں اک دن، یہی تیلیاں قفس کی
جو گرے ہیں چند تنکے، مری شاخِ آشیاں سے

مری بات تُو جو مانے، تو یہ چھوڑ دے بہانے
جو "نہیں" سے بات بگڑی، وہ سنوار ایک "ہاں" سے

ابھی حوصلے نکالو، ابھی اور کچھ ستا لو
تُمہیں پھر پتہ چلے گا، جو ہم اُٹھ گئے جہاں سے

وہ نہ پا سکیں گے منزل، اُنہیں کچھ نہ ہو گا حاصل
جو بچھڑ گئے ہیں قصدًا، سرِ راہ کارواں سے

وہ حَسین دورِ ماضی، کسی طرح لَوٹ آتا
میرا سینہ پھٹ رہا ہے غمِ یادِ رفتگاں سے

اُسے جانتی ہے دنیا، اُسے مانتا ہے عالَم
جو نصیؔر کو لگن ہے، ترے سنگِ آستاں سے

◎

چارۂ دردِ جگر سرکار رہنے دیجیے

عُمر بھر اپنا مجھے بیمار رہنے دیجیے

آنکھ پُرنم ، وا لبِ گفتار رہنے دیجیے

اعتبارِ گرمیِ بازار رہنے دیجیے

ذہن اپنا مطلعِ انوار رہنے دیجیے

رات دن محوِ جمالِ یار رہنے دیجیے

قُرب کی یہ آخری صورت نہ مجھ سے چھینیے

در سے اُٹھوایا ، پسِ دیوار رہنے دیجیے

آپ مجھ سے اب نہ سُنیے گا کبھی کوئی گلہ

ہو گیا جو ہو گیا ، اِس بار رہنے دیجیے

جو گزرنی تھی وہ گزری ، جو ستم تھا ہو چکا

چھوڑیے اِس بات کو ، سرکار ! رہنے دیجیے

آپ کے ہر حکم کی تعمیل میرا فرض ہے

اِس قدر تاکید ، یہ اصرار رہنے دیجیے

یا مرے غم کا مداوا کیجیے بندہ نواز !

یا تباہی پر مجھے مختار رہنے دیجیے

آپ کی قسمت سُکوں ، میرا مقدّر اضطراب

آپ سو جائیں ، مجھے بیدار رہنے دیجیے

میرے اظہارِ تمنّا پر یہ کیسی برہمی

بندہ پرور ! چھوڑیے ، سرکار ! رہنے دیجیے

کیوں مٹاتے ہیں نصیرؔ آپ اِس طرح داغِ جگر

غم کے باقی کچھ نہ کچھ آثار رہنے دیجیے

◎

پھرا کر اپنے رُخ کو پھیر میں چلمن کے بیٹھے ہیں
وہ سچ مُچ ہم سے ناخوش ہو گئے، یا بن کے بیٹھے ہیں

غضب کیا ہے جو ہم کوچے میں اُس پُرفن کے بیٹھے ہیں
کسی کو کیا غرض، مالک ہیں اپنے من کے "بیٹھے ہیں"

الٰہی! خیر دل کی، جان کی، چشمِ تماشا کی
بلا کی شان سے محفل میں وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

بٹھا کر پاس اُس نے دُور دل سے کر دیا ہم کو
یہ کیا معلوم تھا پہلو میں ہم دشمن کے بیٹھے ہیں

جنھوں نے جیتے جی مجھ سے نہ میرا حال تک پوچھا
وہی اب سر جُھکائے سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

کہاں ایسا مقدر تھا کہ ہوتا یہ شرف حاصل
عنایت ہے کہ سائے میں ترے دامن کے بیٹھے ہیں

یہ میری بزم ہے آئینہ بندی عہدِ ماضی کی
یہاں مل جُل کے کچھ ساتھی مرے بچپن کے بیٹھے ہیں

ستم صیّاد کا برحق، زباں اپنی بیاں اپنا
قفس میں ہیں، مگر قصّے لئے گلشن کے بیٹھے ہیں

حیات و موت ہیں دونوں ترے کوچے سے وابستہ
جنازہ بن کے اُٹھیں گے، تمنّا بن کے بیٹھے ہیں

نصیرؔ! اُن کو کوئی پہچان لے، یہ غیر ممکن ہے
کچھ ایسا رُوپ بدلا ہے، کچھ ایسے بن کے بیٹھے ہیں

◎

دیکھیں وہ آکے میرا تماشا خدا کرے
میرے جُنوں میں رنگ وہ پیدا خدا کرے

تم پر جفا کرے، کوئی تم سا خدا کرے
کچھ اور ہو نہ ہو، مگر ایسا خدا کرے

لے اِنتقام کوئی ہمارا، خدا کرے
تم سے بھی ہو وفا کا تقاضا، خدا کرے

دل ہے ملُول، اور نگاہیں اُداس ہیں
مِل جائے کاش! تیرا سہارا خدا کرے

مَیں نے کہا، کہ مجھ پہ کبھی مہرباں تو ہوں
ہنس کر کہا، خیال ہے اچھا "خدا کرے"

وہ مِل گئے، نگاہ ملی، دل سے دل مِلا
اب اِس کرم کے بعد کہو، کیا خدا کرے

دُنیا بنائی، ہم کو سجایا، مِٹا دیا
دیکھیں اب آگے اور بھی کیا کیا خدا کرے

دل کو یقیں ہے اُن کی ملاقات کا نصیرؔ
اب دیکھیے کرم وہ کریں، یا خدا کرے

◎

دیدۂ تر میں کہاں پھر شبِ غم رُکتے ہیں
اشک اک بار جو چل نکلیں ، تو کم رُکتے ہیں

آ کے چل دیتے ہیں، مسجد میں یہ کم رُکتے ہیں
میکدے ہی میں بس اب شیخِ حرم رُکتے ہیں

دشمنوں پر بھی وہی جُود و سخا کا عالَم
اپنی بخشش سے کہیں اہلِ کرم رُکتے ہیں

جیسے پاؤں میں کوئی ڈال رہا ہو زنجیر
جانے یہ کس کی گلی ہے کہ قدم رُکتے ہیں

آ ہی جاتا ہے خیال آپ کی رُسوائی کا
نالے آ آ کے لبوں تک شبِ غم رُکتے ہیں

اک ترا ذکر کہ سر خَم ہے عقیدت سے مرا
اک ترا نام کہ ہیبت سے قلم رُکتے ہیں

وہ تو ہم رُک گئے کیا سوچ کے معلوم نہیں
برملا کہنے سے ورنہ کہیں ہم رُکتے ہیں

گرچہ رُکنے کی نہیں اب کوئی صورت باقی
پھر بھی تُو روکے تو ہم تیری قسم، رُکتے ہیں

حضرتِ دل سے نصیرؔ آج یہ کہنا ہے ہمیں
آپ اُس بزم میں جاتے ہیں ' تو ہم رُکتے ہیں

◎

شوق سے اُس کی گلی میں جاؤ تو
حضرتِ دل ! ہو گیا پتھراؤ "تو"

حُرمتِ مے بے پیئے سمجھاؤ تو
شیخ صاحب ! میکدے میں آؤ تو

ڈھونڈنی ہے اپنی قسمت کی لکیر
ہم بھی دیکھیں، ہاتھ اِدھر تم لاؤ تو

دو گھڑی کی بات ہے، تکرار کیا
دو گھڑی کو تم مرے گھر آؤ تو

ہو ہی جائیں گے وہ آخر مہرباں
باتوں باتوں میں اُنہیں بہلاؤ تو

دشت کے کانٹو ! لہو پینا، مگر
کچھ دنوں تلوے مرے سہلاؤ تو

پھر چلا لینا نظر کے تیر تم
دل کے بھر لینے دو پہلے گھاؤ تو

شوخیوں سے، ناز سے، انداز سے
ہم بہک جائیں گے، تم بہکاؤ تو

گفتگو میں پیار کے دو بول تھے
پھر وہی فقرہ ذرا دہراؤ تو

چل نہ دیں دیوارِ زنداں توڑ کر
وحشیوں کو بیڑیاں پہناؤ تو

میری قسمت کے نکل جائیں گے بَل
اپنی زُلفوں کو ذرا سُلجھاؤ تو

جا رہا ہے وہ جنازہ عشق کا
مار ڈالا ہے جسے، دفناؤ تو

تا بکے اُس کی توجہ کی طلب
نامناسب ہی رہا برتاؤ "تو"

جا رہا ہُوں مَیں نصیرؔ اُن کی طرف
درمیاں میں پڑ گئے اُلجھاؤ "تو"

◎

ہم کو ہے مطلوب ہر دم خیرخواہی آپ کی
تا ابد قائم رہے ہر آن شاہی آپ کی

پردۂ معصومیت میں قتلِ عاشق بیدریغ
اللہ اللہ یہ ادائے بے گناہی آپ کی

ختم ہی کر دیں گے مجھ کو آخرالامر ایک دن
یہ تغافل آپ کے، یہ کم نگاہی آپ کی

آفتِ دل آفتِ جاں دشمنِ ایمان و دیں
یہ ادا و ناز یہ کافر نگاہی آپ کی

یہ وفاداری جہاں میں کم ملے گی آپ کو
ہم نے جس انداز سے الفت نباہی آپ کی

آپ نے حق میں ہمارے کی بُرائی عُمر بھر
عافیت حق سے ہمیشہ ہم نے چاہی آپ کی

حضرتِ دل! یہ ارادہ اور یہ حُسنِ طلب
لاج رکھّے گا محبت میں خدا ہی آپ کی

آپ ایسے ہیں کہ اپنوں کو سمجھتے ہی نہیں
ہم نے کر دیکھی ہے برسوں خیرخواہی آپ کی

لُوٹ لیتی ہے نصیرِ بے نوا کو عشق میں
دلربائی، کج ادائی، کج کلاہی آپ کی

کیا کریں شکوہ کسی کا ہم محبت میں نصیر
اپنے ہاتھوں ہم نے جب اپنی تباہی “آپ کی”

◎

ستم پر شرطِ خاموشی بھی اُس نے ناگہاں رکھ دی
کہ اک تلوار ' اپنے اور میرے درمیاں رکھ دی

یہ پوچھا تھا کہ مجھ سے جنسِ دل لے کر کہاں رکھ دی
بس اِتنی بات پر ہی کاٹ کر اُس نے زباں رکھ دی

پتہ چلتا نہیں، اور آگ لگ جاتی ہے تن من میں
خدا جانے ' کسی نے غم کی چنگاری کہاں رکھ دی

چڑھاوے چڑھ رہے تھے تُربتِ بُلبل پہ پھولوں کے
مگر ہم تھے کہ ہم نے لا کے شاخِ آشیاں رکھ دی

بتاؤ ! کیا کیا تم نے مرا دل چھین کر مجھ سے
یہ ایسی شَے نہیں تھی جو یہاں رکھ دی، وہاں رکھ دی

ادا ہوتے رہیں گے اُن کے دَر پر عُمر بھر سجدے
مَشیّت نے مری قسمت میں خاکِ آستاں رکھ دی

شریکِ بزم تھا واعظ تو سامانِ ضیافت میں
ذرا سی ہنس کے ساقی نے بہ طورِ امتحاں "رکھ دی"

بہار آنے پہ گلشن تک رسائی جب ہوئی مشکل
قفس کی تیلیوں پر ہی بِنائے آشیاں رکھ دی

صبا نے احترامِ جذبِ دل کا پاس یُوں رکھّا
اُٹھا کر لاش بُلبل کی گلوں کے درمیاں رکھ دی

مرا دل چھید کر آنکھیں جُھکا لیں اُس ستمگر نے
کہوں اب کیا کہ اُس نے تیر برسا کر کماں رکھ دی

زمانہ کیا کہے گا آپ کو ' اِس بدگمانی پر
مری تصویر بھی دیکھی، تو ہو کر بدگُماں "رکھ دی"

مرے حرفِ تمنّا پر چڑھائے حاشیے کیا کیا
ذرا سی بات تھی ' تم نے بنا کر داستاں رکھ دی

جو آیا بتکدے میں، اُس نے سجدوں پر کیئے سجدے
الٰہی ! تُو نے کیا شے اِن بُتوں کے درمیاں رکھ دی

تنے ہیں تیر مژگاں کے ' کھنچے ہیں اُن کے دو اَبرو
کماں کے ساتھ ہی اک اور قدرت نے کماں رکھ دی

نصیر اب کس سے شکوہ کیجیے ' یہ شُکر کی جا ہے
بہاروں کی طلب تھی، اُس نے قسمت میں خزاں رکھ دی

◎

یہ زمانہ یہ دَور کچھ بھی نہیں — اِک تماشا ہے اور کچھ بھی نہیں

اِک ادا ہے بس اور کچھ بھی نہیں — یہ جفائیں یہ جَور کچھ بھی نہیں

اِک تری آرزو سے ہے آباد — ورنہ اِس دل میں اور کچھ بھی نہیں

عشق، رسم و رواج کیا جانے — یہ طریقے یہ طَور کچھ بھی نہیں

وہ ہمارے ہم اُن کے ہو جائیں — بات اِتنی ہے اور کچھ بھی نہیں

جلنے والوں کو صرف جلنا ہے — اُن کی قسمت میں اور کچھ بھی نہیں

چشمِ ساقی کا فیض ہے سب کچھ — جام و ساغر کا دَور کچھ بھی نہیں

دونوں عالم میں بس تمہیں تم ہو — دونوں عالَم میں اور کچھ بھی نہیں

آئنہ خانۂ وجود و عدم — دیکھئے جب بغَور! کچھ بھی نہیں

اے نصیر! انتظار کا عالَم
اک قیامت ہے اور کچھ بھی نہیں

◎

آج مل کر بھی اُن سے نہ کچھ بات کی
ہائے مجبوریاں میرے حالات کی

صبح کو بخش دی، جو بچی رات کی
یہ عنایت ہے پیرِ خرابات کی

تیز تر کیوں نہ ہو شعلۂ آرزو
ہجر کی رات، پھر وہ بھی برسات کی

اَللہ اَللہ مجازِ حقیقت نُما
وہ بشر ہے، کہ تصویر ہے ذات کی

وہ جو خوددار ہے، مَیں بُرا کیوں کہوں
اِس صِفت میں جھلک ہے مری ذات کی

حاصلِ زندگی، عِشق کا ماحصَل
چند گھڑیاں وہ اُن سے ملاقات کی

شُکر کر، اُس کا شکوہ نصیر اب نہ کر
کل وہ آیا، مخاطب ہُوا، بات کی

اے نصیر! اُن کو اپنا بنالیں گے ہم
کوئی صورت تو نکلے ملاقات کی

◎

داغ ہیں دل میں، ہار پھولوں کا — آؤ! دیکھو مزار پھولوں کا

عارضی ہے نِکھار پھولوں کا — کچھ نہیں اعتبار پھولوں کا

بڑھ گیا اعتبار پھولوں کا — تم نے پہنا جو ہار پھولوں کا

ہے چمن میں خزاں کی یہ سازش — مُنہ نہ دیکھے بہار، پھولوں کا

اُن کی کانٹوں میں زندگی گزری — تھا بہت جن کو پیار پھولوں کا

وہ نہیں تو چمن ہے ویرانہ — جمگھٹا ہو ہزار، پھولوں کا

ہمقفس چھیڑتے ہیں کیوں مجھ سے — تذکرہ بار بار پھولوں کا

مسکرائے نہ تھے کہ مُرجھائے — ہائے، انجامِ کار پھولوں کا

جب چمن میں خزاں کا ڈیرا ہو — کیا چلے کاروبار پھولوں کا

دیکھتے دیکھتے خزاں آئی — چِھن گیا اقتدار پھولوں کا

اور کیا جلوۂ بہارِ چمن — اک تماشا ہے چار پھولوں کا

یُوں کِھلا ہے نصیر داغِ جگر
جیسے ہو تاجدار پھولوں کا

◎

جہانِ دیدہ و دل اب لُٹا معلوم ہوتا ہے
نظر کی اوٹ میں کوئی چُھپا معلوم ہوتا ہے

طبیبوں کو مرا دُکھ لا دوا معلوم ہوتا ہے
مگر اب تم بتاؤ، تم کو کیا معلوم ہوتا ہے

جگر میں دَرد پہلے سے سِوا معلوم ہوتا ہے
دہانِ زخم اب کُھلنے لگا "معلوم ہوتا ہے"

چُھپا بیٹھا ہے آخر کون میرے سازِ ہستی میں
بہر پردہ کوئی صرفِ نوا معلوم ہوتا ہے

نمودِ زندگی کے رُوپ میں رنگِ قضا نکھرا
ستم بھی آپ کا کتنا بَھلا معلوم ہوتا ہے

جمالِ یار! تُو نے دل پہ قابو پالیا آخر
ترا جادُو بڑا چلتا ہُوا معلوم ہوتا ہے

جدھر نظریں اُٹھاؤ ایک عالَم ہے تحیّر کا
جسے دیکھو، وہی اِک نقش سا معلوم ہوتا ہے

ترا جو لفظ بھی مُنہ سے نکل جائے مرے حق میں
مجھے وہ اپنی قسمت کا لکھا معلوم ہوتا ہے

پھر آ پہنچا ہُوں اُس در پر جہاں لُوٹا گیا تھا میں
مرا رہزن ہی مجھ کو رہنما معلوم ہوتا ہے

اُسی کو دیکھتے ہی دَم پہ بن جاتی ہے محفل میں
وہی جو زندگی کا آسرا معلوم ہوتا ہے

تڑپنا، لَوٹنا، رونا، مچلنا اُن کے قدموں پر
یہ عالَم سارے عالَم سے جُدا معلوم ہوتا ہے

اگر دیکھو تو رشکِ صد گلستاں ہے جمال اُن کا
جو سوچو تو جنوں کا سلسلا معلوم ہوتا ہے

نصیرؔ اُن کی پرستش آپ ہی تنہا نہیں کرتے
زمانہ اُن کی صورت پر فدا معلوم ہوتا ہے

◎

بہار آئی، بہار آنے کے دن ہیں — یہی تو پھول، پیانے کے دن ہیں

کسی پر اب شباب آنے کے دن ہیں — لجا کر دل کو تڑپانے کے دن ہیں

جوانی، اور پھر اُن کی جوانی — نگاہوں میں سما جانے کے دن ہیں

ابھی تو حُسن کا نشّہ چڑھا ہے — ابھی تو اُن کے اترانے کے دن ہیں

مِرا دل بھی لئے جا ساتھ قاصد! — یہ تحفہ اُن کو پہنچانے کے دن ہیں

گیا ساقی اُلٹ کر جام و ساغر — گراں رندوں پہ میخانے کے دن ہیں

ابھی مجھ سے نہیں وہ بے تکلّف — ابھی کچھ اور شرمانے کے دن ہیں

جواں تم ہو، جواں ہم ہیں، جواں دل — تڑپنے اور تڑپانے کے دن ہیں

حیا و حُسن ہیں شانہ بہ شانہ — کسی کی زلف سُلجھانے کے دن ہیں

ابھی بُھولی نہیں ہے مجھ کو وحشت — ابھی قسمت میں ویرانے کے دن ہیں

اُنہیں ناز و ادا سے کون روکے — وہ اِٹھلائیں، کہ اِٹھلانے کے دن ہیں

نصیؔر اب فصلِ گُل آئی، سنبھلیے
گریباں چاک ہو جانے کے دن ہیں

◎

اک حشر ہے اے دل! وہ ہوئے چیں بہ جبیں تو
ٹھہری نہ ترے پاؤں کے نیچے جو زمیں "تو"

کہنے کو تو کہہ دُوں گا ملیں گے وہ کہیں تو
آیا نہ اُنہیں میری محبّت کا یقیں "تو"

گلشن میں، بیاباں میں اُسے ڈھونڈ رہا ہُوں
مِل جائے گا اک دن دلِ گُم گشتہ کہیں تو

اب اور وہ کیا حال مرا پوچھ رہے ہیں
باتیں مِری تفصیل سے قاصد نے کہیں تو

مَیں جب بھی یہ کہتا ہوں ستم مجھ پہ ہوئے ہیں
وہ صاف مُکر جاتے ہیں کہتے ہیں "نہیں تو"

مانا کہ فلک درپئے آزار رہا ہے
شامل نظر آئی ترے کوچے کی زمیں، تو؟

جو بات مجھے کہنی ہے ، تم ہی سے کہوں گا
میرے لئے سب کچھ ہو زمانے میں تمہیں تو

آئے ہیں تری انجمنِ ناز میں پھر ہم
ٹوٹی تھی کبھی برقِ ستم ہم پہ یہیں تو

اب روک لے چلتی ہوئی تلوار کو قاتل !
اب کون رہا ، رہ گئے بس ایک ہمیں تو

ہر چند نظر میں کوئی منزل نہیں پھر بھی
پہنچائے گی یہ گردشِ ایام کہیں تو

در پردہ جو تڑپائے ہُوئے ہے دلِ عالَم
ڈھونڈیں گے نصیرؔ اُس کو ، ملے گا وہ کہیں تو

◎

مرنا جینا ایک ہے اُس بُلبلِ ناشاد کا
جس کو اک اک موڑ پر خطرہ رہے صیّاد کا

پُوچھتے ہو حال کیا اِس خانماں برباد کا
باغباں کی مہربانی ہے ، کرم صیّاد کا

انعقادِ بزم ہو یا اہتمامِ ذکر ہو
اک طریقہ یہ بھی ہے بچھڑے ہُوؤں کی یاد کا

حشر ہے یہ حشر ، بندہ بن ، خدا کو یاد کر
یہ دُعا کا وقت ہے ، موقع نہیں بیداد کا

اب تو اے صیّاد ! تیرے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی
برق نے پھونکا نشیمن بُلبلِ ناشاد کا

زیرِ لب یہ مُسکرا کر دیکھنا میری طرف
ایک پہلو یہ بھی ہے ، ظالم تری بیداد کا

آنسوؤں کے تار سے چاکِ گریباں تک نصیرؔ
سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اُن کی یاد کا

◎

آغوشِ جنوں میں جا رہا ہوں — ہر غم سے نجات پا رہا ہوں

وہ ناؤ مجھی کو لے کے ڈُوبی — جس ناؤ کا ناخدا ، رہا ہوں

گلشن میں کھٹک رہے تھے کانٹے — صحرا میں سکون پا رہا ہوں

وہ مجھ سے کہاں چُھپیں گے جا کر — مَیں خود ہی نظر چُرا رہا ہوں

پوچھو نہ عذابِ راہِ منزل — کانٹوں سے گزر کے جا رہا ہوں

اِس درجہ تو بے رُخی نہ برتو — رودادِ وفا سُنا رہا ہوں

مطلب نہیں اور کچھ وفا سے — آئینہ اُنہیں دِکھا رہا ہوں

قدموں سے لپٹ رہے ہیں رَستے — اے منزلِ شوق ! آ رہا ہوں

محفل میں تری بُرا ہوں مَیں ہی — اچھا ہے کہ اُٹھ کے جا رہا ہوں

اک آپ ، کہ میرے ہو نہ پائے — اِک مَیں ہوں، کہ آپ کا "رہا ہوں"

کیا شے تھی نصیر وحشتِ دل
مَیں خود سے دِنوں خفا رہا ہوں

◎

شُعورِ غم ہے ، مگر شکوۂ ستم تو نہیں
وہ اور ہو گا کوئی بیقرار ، ہم تو نہیں

یہ اور بات ہے سب معترض ہیں، ہم تو نہیں
مگر ستم تو ستم ہی ہُوا ، کرم تو نہیں

زمین جرأتِ دیوانگی پہ لرزی ہے
وفا کی راہ میں لرزاں مرے قدم تو نہیں

جُدا ہُوا ہے تو پھر جان کی امان نہ دے
ترے بغیر جئیں ، ہم میں اِتنا دَم تو نہیں

نظر اُٹھاؤ کہ ہر سُو ہیں منتظر لاکھوں
تمہارے لُطف کے اُمیدوار کم تو نہیں

یہ اور بات ، کہ ممنون ہُوں دعا گو ہُوں
کرم کسی کا بہ اندازۂ ستم تو نہیں

تری نگاہ میں ہے جستجو کا اک انداز
تلاش جس کی رہی ہے تجھے، وہ ہم تو نہیں؟

فضول اپنے پرائے کو اعتراض ہُوا
محبّت آپ سے، ایسا کوئی ستم تو نہیں

بلا کی نامۂ اعمال پر ہے گُل کاری
کسی کی ہوگی عبارت، مرا قلم تو نہیں

یہ اور بات کہ مَیں ہی زباں سے کچھ نہ کہوں
مگر حضورِ ستم میں کسی سے کم تو نہیں

ہر ایک ساغرِ مَے کا حساب ہے اے شیخ!
شراب ہے کوئی ڈوبی ہُوئی رقم تو نہیں

نصیرؔ! کس لئے آنکھیں بھر آئیں دنیا کی
ہمارے اشک ہیں یہ، داستانِ غم تو نہیں

◎

مری زندگی تو فراق ہے وہ ازل سے دل میں مکیں سہی
وہ نگاہِ شوق سے دُور ہیں، رگِ جاں سے لاکھ قریں سہی

ہمیں جان دینی ہے ایک دن وہ کسی طرح، وہ کہیں سہی
ہمیں آپ کھینچیے دار پر جو نہیں کوئی، تو ہمیں سہی

غمِ زندگی سے فرار کیا یہ سکون کیوں، یہ قرار کیا
غمِ زندگی بھی ہے زندگی، جو نہیں خوشی تو نہیں سہی

سرِ طُور ہو، سرِ حشر ہو، ہمیں اِنتظار قبول ہے
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی، وہ کہیں سہی

نہ ہو، اُن پہ جو مرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہَوس نہیں
مَیں اُنہیں کا تھا، مَیں اُنہیں کا ہُوں، وہ مرے نہیں تو نہیں سہی

مجھے بیٹھنے کی جگہ ملے، مری آرزو کا بھرم رہے
تری انجمن میں اگر نہیں، تری انجمن کے قریں سہی

ترے واسطے ہے یہ وقف سر، رہے تا ابد ترا سنگِ در
کوئی سجدہ ریز نہ ہو سکے تو نہ ہو، مری ہی جبیں سہی

مری زندگی کا نقیب ہے نہیں دُور، مجھ سے قریب ہے
مجھے اُس کا غم تو نصیب ہے وہ اگر نہیں، تو نہیں سہی

جو ہو فیصلہ وہ سُنائیے، اِسے حشر پر نہ اُٹھائیے
جو کریں گے آپ ستم وہاں، وہ ابھی سہی، وہ یہیں سہی

اُسے دیکھنے کی جو لَو لگی تو نصیر دیکھ ہی لیں گے ہم
وہ ہزار آنکھ سے دُور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی

◎

کُھلی جو آنکھ، چمن تھا، نہ آشیانا تھا
قَفس میں اپنے مقدر کا آب و دانا تھا

وہ دل اُڑایا جو اخلاص میں یگانا تھا
نگاہِ یار! بَلا کا ترا نشان تھا

رفیق کوئی نہ تھا، بے وفا زمانا تھا
تمہیں تو یُوں نہ مرے غم پہ مسکرانا تھا

جہاں تُو نغمہ سَرا ہے وہیں پہ اے بُلبل!
کبھی چمن میں ہمارا بھی آشیانا تھا

یہ کیا کہ غیر کو بھی درمیاں لے آئے
خُود آزماتے، اگر مجھ کو آزمانا تھا

اُڑا دیئے مرے ہوش و حواس ساقی نے
نظر شراب نہیں تھی، شراب خانا تھا

جو آج غیروں سے مِل کر ہوئے ہیں بیگانے
وہ مہربان تھے ہم پر بھی ، اک زمانہ تھا

کہا وفا ، تو کہا "اِس کی کیا ضرورت ہے"
کہا "خُلوص" ، کہا "وہ تو اک بہانہ تھا"

یہ دَور اُن کے مرے درمیاں بھی گزرا ہے
خُوشی کے دن تھے ، محبّت تھی ، دوستانہ تھا

یہ کُوئے یار ہے منزل بھی اور مقتل بھی
نصیرؔ ! سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا تھا

◎

پھیکی ہے فضا ، رنگ نیا مانگ رہے ہیں
آدابِ چمن ، خُونِ وفا مانگ رہے ہیں

اُس بُت سے وفاؤں کا صِلا مانگ رہے ہیں
اب تک جو کسی کو نہ مِلا ، مانگ رہے ہیں

سب کوچۂ جنّت کے طلب گار ہیں ، لیکن
ہم کوچۂ جاناں کی ہَوا مانگ رہے ہیں

کیوں بیٹھے ہیں مُنعم ترے دروازے پہ جَم کر
پُوچھے تو کوئی اِن سے ، یہ کیا مانگ رہے ہیں

ہر بندہ ہے دنیا میں اِسی در کا بھکاری
اللہ سے سب شاہ و گدا مانگ رہے ہیں

ہے دھوم گلستاں میں اب اُن دیدہ وروں کی
کانٹوں سے جو پھولوں کی رِدا مانگ رہے ہیں

جو اُن کے پَر و بال کی پرواز بڑھا دے
مرغانِ چمن ایسی فضا مانگ رہے ہیں
ہم بھی ہیں نصیرؔ اُن کی تجلّی کے بھکاری
آئینۂ ہستی پہ جِلا مانگ رہے ہیں

◎

کام اُس کا نہ کسی ڈھب سے ، نہ تیور سے چلا
کوئی تھامے ہوئے دل آج ترے دَر سے چلا
لے کے دل اُس نے اُلٹ دی ہے بساطِ اُلفت
چال اپنی بھی چلا وہ ، تو مرے گھر سے چلا
چشمِ ساقی نے پلائی تو کہیں بات بنی
کام مَے کش کا نہ شیشے سے ، نہ ساغر سے چلا
آ بھی جا ! ورنہ یہ بیمارِ شبِ ہجر نہیں
قبر میں جا کے یہ ٹھہرے گا ، جو بستر سے چلا
کس لئے دل کو رہِ شوق کا ساتھی نہ کہوں
ہر قدم ساتھ دیا ، میرے برابر سے چلا
بات تھی اُس کی کہ کلیوں کے چٹکنے کا سماں
رنگ و آہنگ کا جھونکا سا گُلِ تر سے چلا

لکھ گیا حالِ جُنوں شہر کی دیواروں پر
اک وہ فوّارہ لہو کا جو مرے سَر سے چلا

قیس و فرہاد ہوں ، یا وامق و عَذرا ، اب تک
نام جس کا بھی چلا ، عشق کے دفتر سے چلا

راہِ اُلفت میں کسی بُت سے توقّع ہے فضُول
کھا گیا چوٹ وہ ، ٹکرا کے جو پتّھر سے چلا

راستے مہکے ، در و بام پہ رونق آئی
موجۂ بادِ سَحَر بن کے کوئی گھر سے چلا

عشق کی راہ میں منزل ہے تو تسلیم و نیاز
دو قدم چل نہ سکا ، چال جو دلبر سے چلا

میرے گھر پر بھی نصیرؔ آج کوئی آیا ہے
بات قسمت سے بنی ، کام مقدّر سے چلا

◎

یہ تمکنتِ حُسن کی بانی ، نہیں رُکتی
روکے سے کسی کے بھی ، جوانی نہیں رُکتی

تدبیر سے آفت ہے جو آنی ، نہیں رُکتی
تنکوں سے تو دریا کی روانی نہیں رُکتی

جاتے ہو تو پھر گریۂ پیہم سے نہ ٹوکو
کچھ بھی ہو ، مِری اشک فشانی نہیں رُکتی

جو نقش ہے دنیا میں وہ مائل بہ فنا ہے
ہو کیسی ہی مضبوط نشانی، نہیں رُکتی

اُس وقت تک اُٹھیں گے یہ طوفان برابر
جب تک مِرے اشکوں کی روانی نہیں رُکتی

اب صبح کے تاروں کی کرن پھوٹ رہی ہے
روکو بھی تو اب رات سُہانی نہیں رُکتی

کر دیتی ہے ماحول کو مجبورِ سماعت
چل نکلے اگر دل کی کہانی ، نہیں رُکتی

کہہ دو، کہ جنازے پہ مرے آکے نہ روئیں
وہ روئے تو پھر مرثیہ خوانی نہیں رُکتی

یہ آگ ہے ، بھڑکے گی نصیر اور زیادہ
اب تو یہ مری شعلہ بیانی نہیں رُکتی

◎

حُسن کو جب جلال آتا ہے　　آئنوں پر زوال آتا ہے
جو بھی صاحب جمال آتا ہے　　آپ اپنی مثال آتا ہے
لُطف ہو، لاگ ہو، لگاوٹ ہو　　حُسن کو ہر کمال آتا ہے
آپ کو کیا، کوئی مَرے کہ جیئے　　آپ کو کب خیال آتا ہے
مسکراتی ہے دیکھ کر دنیا　　جب کسی پر زوال آتا ہے
تم کبھی مہربان تھے ہم پر　　دل میں اکثر خیال آتا ہے
ہے وہ اک نغمہ قُلقُلِ مینا　　محتسب تک کو حال آتا ہے
کج ادائی ، ادا سہی ، لیکن　　دل کے شیشے میں بال آتا ہے

دل لگاتے نصیر دنیا سے
عاقبت کا خیال آتا ہے

◎

آہ میں یہ اثر چاہتا ہوں
اُن کو پیشِ نظر چاہتا ہوں

گفتگو مختصر چاہتا ہوں
اُن سے مِلنا مگر چاہتا ہوں

ایک دو بار کیا گھر پہ آئے
یہ کرم عُمر بھر چاہتا ہوں

جو مرے دل کو کُندن بنا دے
ایک ایسی نظر چاہتا ہوں

تیرے پانے کو اے میری منزل!
زندگی بھر سفر چاہتا ہوں

تُو مجھے اپنے دل میں جگہ دے
سَر چُھپانے کو گھر چاہتا ہوں

ایک آنسو ، مری داستاں ہو
بس یہی چشمِ تر! چاہتا ہوں

اپنا اپنا مذاقِ طلب ہے
خوب سے خوب تر چاہتا ہوں

جو خبر ہو نصیرؔ اُس طرف کی
وہ خبر معتبر چاہتا ہوں

◎

پریشاں ہُوں کیا بال و پَر کے لئے
ہوئے قید ہم عُمر بھر کے لئے

نہیں کچھ سکونِ نظر کے لئے
بہت جائزے بحر و بر کے "لئے"

کہاں ضبطِ مستی ، کہاں ہا و ہُو
محبت نہیں شور و شر کے لئے

خدا کے لئے غم میں آہیں نہ بھر
تڑپتا رہے گا اثر کے لئے

تمہارے تبسّم کی اِک اِک ادا
قیامت ہے اہلِ نظر کے لئے

کہاں جا رہے ہو سرِ شام تم
قدم آج اُٹھے کدھر کے لئے

سُکونِ دل و جاں لُٹاتا رہا
فقط اک سکونِ نظر کے لئے

مِلا میری فطرت کو دیوانہ پن
ترے حُسنِ دیوانہ گر کے لئے

کہاں میری جانب توجّہ تری
اِدھر کے لئے ہے، اُدھر کے لئے

محبت میں ہم تا دمِ واپسیں
ترستے رہے چارہ گر کے لئے

قفس، دام، صیاد، گُل چیں، خزاں
نصیرؔ! اِتنے غم مُشتِ پر کے لئے؟

نصیرؔ اُن کا غم محترم ہے مجھے
یہ سودا ہے بس میرے سر کے لئے

◎

عجب ہے شبِ غم کے ماروں کی دُنیا
لرزتی ہے جن سے ستاروں کی دُنیا

یہ بزمِ بُتاں ہے نظاروں کی دُنیا
اداؤں کی بستی ، اشاروں کی دُنیا

صبا نے کیئے چاک ، پُھولوں کے دامن
جو دیکھی ترے دل فگاروں کی دُنیا

ہمارے لیئے ہے ، تمہارے لئے ہے
خزاں کا زمانہ ، بہاروں کی دُنیا

اِنھیں کس کی پَروا ، اِنھیں کس سے مطلب
الگ سب سے ہے بادہ خواروں کی دُنیا

جگر چاک ، دل چاک ، نم ناک آنکھیں
یہ ہے آپ کے بیقراروں کی دُنیا

چُنی ہے اِس انداز سے اُس نے افشاں
جبیں بن گئی چاند تاروں کی دُنیا

جدھر سے گُزرتے ہیں دیوانے تیرے
قدم چُومتی ہے بہاروں کی دُنیا

ہمیں ہے فقیری میں شاہی میسّر
کہاں ہم ، کہاں تاجداروں دُنیا

نصیؔر ! اُس کو اللہ آباد رکھّے
اُجاڑی ہے جس نے ، ہزاروں کی دُنیا

◎

جب مُسافر خوگرِ گردِ سفر ہو جائے گا
جو قدم اُٹھے گا اُس کا ، معتبر ہو جائے گا

دو دلوں میں کوئی سمجھوتہ اگر ہو جائے گا
تا بہ منزل طے بآسانی سفر ہو جائے گا

جب مذاقِ دید بڑھ کر پختہ تر ہو جائے گا
آئنے میں رُونما آئینہ گر ہو جائے گا

خود اُٹھا دو پردۂ در تم ، اِسی میں خیر ہے
ورنہ دیوانہ تمہارا پردہ در ہو جائے گا

جس گھڑی وہ مائلِ لطف و کرم ہو جائیں گے
دل ہمارا کاسۂ دریُوزہ گر ہو جائے گا

غم ملا، حسرت گھٹی ، ارماں مِٹے، ہم لُٹ گئے
کیا خبر تھی، دل کا سودا دردِ سر ہو جائے گا

اُس نظر کا ہر اشارہ تیر سے کچھ کم نہیں
تیر بھی ایسا، اِدھر سے جو اُدھر ہو جائے گا

سُنتے رہتے ہیں وہ تیرا حالِ دل اکثر نصیر
اب یہ افسانہ یقیناً معتبر ہو جائے گا

◎

وعدہ ہو ہزار دوستی کا — پھر بھی ہے بھروسہ کیا کسی کا

انجام بُرا ہے دشمنی کا — نیکی سے جواب دے، بَدی کا

کیا حالِ مریضِ غم سُنائیں — رخصت بھی وہ ہو چکا کبھی کا

کرتا ہوں مَیں اعتماد تم پر — لو! ہاتھ بڑھاؤ دوستی کا

قاتل ہو جفا کہ شامِ فُرقت — چرچا تو رہے گا آپ ہی کا

کیا بات تھی تیری محفلوں کی — وہ دَور کہاں ہما ہمی کا

تُو ہے، نہ وہ تیری مہربانی — اب فائدہ کیا ہے زندگی کا

مارے کہ جِلائے، اُس کی مرضی
بندہ تو نصیرؔ ہے اُسی کا

◎

سائل پہ کرم طراز ہو جا — اے حُسن! گدا نواز ہو جا

یُوں گردِ رہِ نیاز ہو جا — گُم گشتۂ شہرِ راز ہو جا

آئینۂ شرحِ ناز ہو جا — اے پردہ نشیں! مجاز ہو جا

سر تا بہ قدم نیاز ہو جا — "محمود نہ بن، ایاز ہو جا"

یہ خواب نوازیاں کہاں تک — اے دیدۂ ناز! باز ہو جا

اِتنی تو اُبھر سیاہیِ غم! — عنوانِ شبِ دراز ہو جا

پردہ ہے یہ فرقِ عبد و معبود — بیگانۂ امتیاز ہو جا

حق گو ہے اگر، ثبوت بھی دے — جا! دار پہ سرفراز ہو جا

دل میں بھڑکا کر آتشِ غم — آہن کی طرح گداز ہو جا

نَین اُن سے مِلا کے دیکھ اے دل! — کونین سے بے نیاز ہو جا

کُوچے میں نصیرؔ اُن کے جا کر
سُلطانِ سریرِ ناز ہو جا

◎

دل کسی سے اٹک نہیں سکتا   اب دوبارہ بھٹک نہیں سکتا

اُن کی مرضی نہ ہو، تو گلشن میں   کوئی غنچہ چٹک نہیں سکتا

ضعف کا حال ہے یہ زنداں میں   سر بھی کوئی پٹک نہیں سکتا

ہیں دل و جاں، کسی سے وابستہ   اب وہ دامن جھٹک نہیں سکتا

رکھ دو سینے پہ تم جو پھول سا ہاتھ   خارِ حسرت کھٹک نہیں سکتا

اب وہ آ جائیں میری بالیں پر   دَم زیادہ اٹک نہیں سکتا

کوئی مُرجھائے گا، کِھلے گا کوئی   غنچہ غنچہ چٹک نہیں سکتا

مستعد میرِ کارواں ہو، اگر   کوئی رہ رَو بھٹک نہیں سکتا

اُس کو عرفانِ حق کا دعوٰی ہو؟   دار پر جو لٹک نہیں سکتا

ہو ملاقات کیا نصیرؔ اُن سے
پاس کوئی پھٹک نہیں سکتا

◎

مَیں ہُوں پابندِ رسمِ ادب، کیا کہوں
اپنی بربادیوں کا سبب کیا کہوں

پوچھتے ہیں وہ مجھ سے مرا حالِ دل
یہ بتائے کوئی، اُن سے اب کیا کہوں

ماجرائے وفا ہے قیامت نُما
جو کہا، اُتنا کافی ہے، سب کیا کہوں

آپ ہی کو سُنانا تھی رُودادِ غم
آپ سُنتے نہیں ہیں، تو اب کیا کہوں

ایک دو ہوں تو اُن کو گِنائے کوئی
مجھ پہ ٹوٹے ہیں جو جو غضب، کیا کہوں

اُن کو ضد ہے کہ تیری سُنیں گے نہ ہم
ہائے اب کیا کروں، ہائے اب کیا کہوں

گفتگو کی اجازت نہیں عشق میں
سی گیا ہے کوئی میرے لب ، کیا کہوں
حشر میں وہ مرے سامنے آ گئے
سوچتا ہوں نصیرؔ ! اُن سے اب کیا کہوں

◎

بے وفائی کا گلہ ، شکوۂ بیداد نہیں
بات اِتنی ہے کہ اب طاقتِ فریاد نہیں
مجھ سے مت پوچھ، کہ کیا تُو نے کیا، کیا نہ کیا
اِس قدر تیرے ستم ہیں کہ مجھے یاد نہیں
تیرے کوچے کی بڑی دُھوم ہے سفّاکی میں
ذرّہ وہ کون سا ہے ، جو ستم ایجاد نہیں
بال و پر نوچ کے آزاد کیا ہے مجھ کو
یہ عنایت ہے ؟ تو ظالم مرا صیّاد نہیں
اک قیامت ہیں ، زمانے کے بدلتے تیور
کل جو آباد تھا گھر، آج وہ آباد نہیں
حلقۂ زلف کے قیدی کا خدا ہی حافظ
یہ ہے وہ قید کہ جس کی کوئی میعاد نہیں

دشمن و دوست نمایاں ہیں، تری محفل میں
کوئی پابند نہیں ہے، کوئی آزاد نہیں
بھولے ہم دونوں ہی افسانہ محبت کا نصیرؔ!
کل اُنھیں یاد نہ تھا، آج ہمیں یاد نہیں

◎

دُو بدُو اُن سے، رات ہو ہی گئی
شرحِ ذات و صفات ہو ہی گئی

کامیاب اُن کی گھات ہو ہی گئی
جو نہ ہونی تھی بات، ہو ہی گئی

اُن کی آمد بنی نویدِ سَحَر
شبِ غم سے نجات ہو ہی گئی

اُن کو ضِد تھی کہ حالِ دل نہ کہوں
باتوں باتوں میں بات ہو ہی گئی

ہم نہ تھے غم سے ہارنے والے
مات ہونی تھی، مات ہو ہی گئی

جو گُریزاں رہے نصیرؔ! آخر
ایک دن، اُن سے بات ہو ہی گئی

◎

خدا شاہد کہ نُدرت آفریں ہاتھوں سے کھینچی ہے
تری تصویر جس نے اے حسیں! ہاتھوں سے کھینچی ہے

نظر آتا ہے کیوں مسکا ہُوا سا تار تار آخر
کسی نے کیا تمھاری آستیں، ہاتھوں سے کھینچی ہے؟

کِیا یہ حشر اُس ظالم نے ارمانوں کی میّت کا
کہیں پیروں سے روندی ہے، کہیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

کہاں ہیں اُن کی اِس تصویر میں وہ ناز کے تیور
مُصوّر! تُو نے یہ دل سے نہیں، ہاتھوں سے کھینچی ہے

ادا سجدہ ہُوا بے ساختہ یُوں اُن کی چوکھٹ پر
کسی نے جیسے خود میری جبیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

سُلگتی ہیں نگاہیں، دل پُھنکا، لَو دے اُٹھیں آنکھیں
تری تصویر کس نے آتشیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

مرے سینے پہ رکھ کر ہاتھ، قابُو میں کیا دل کو
مری دولت اداؤں سے نہیں، ہاتھوں سے کھینچی ہے

کھڑے تھے دست بستہ ہم نصیرؔ اُن کی حضوری میں
شبیہِ عجز محفل میں اِنہیں ہاتھوں سے کھینچی ہے

○

مائلِ لُطف، طبیعت کبھی ایسی تو نہ تھی
آپ کو مجھ سے محبّت کبھی ایسی تو نہ تھی

آج بے وقت کدھر آپ نکل آئے ہیں
آپ کو میری ضرورت کبھی ایسی تو نہ تھی

حال پر میرے توجّہ، مری ہر بات پہ جی
اب جو ہے مجھ پہ عنایت کبھی ایسی تو نہ تھی

اب تو ہر وقت ہی ماتھے پہ شکن رہتی ہے
آئنہ دیکھیئے! صورت کبھی ایسی تو نہ تھی

کچھ تو ہے آپ کے اندازِ ستم کا باعث
آئے دن شکوہ شکایت کبھی ایسی تو نہ تھی

ہجر میں آپ نے اک عُمر گزاری ہے نصیرؔ!
بے قراری کی یہ حالت کبھی ایسی تو نہ تھی

○

قدم قدم پہ نظر سے، ترے نشاں گزرے
ہم اپنے ساتھ لئے ایک کارواں گزرے

ترے بغیر جو اے میرے مہرباں! گزرے
خدا گواہ! وہ لمحے بہت گراں گزرے

عجیب سحر ہے ظالم کے رکھ رکھاؤ میں
جفا کرے تو وفا کا مجھے گُماں گزرے

اُنہیں کے سوگ میں روتی ہے رات بھر شبنم
وہ گُل جو باغ سے بے نام و بے نشاں گزرے

تمہاری یاد میں اکثر جو ہم نے جھیلے ہیں
تمہارے دل سے وہ صدمے ابھی کہاں گزرے

ہمارے غم کی کسی نے جھلک نہیں دیکھی
مگر وہ اشک، جو آنکھوں سے ناگہاں گزرے

نصیرؔ! دار و رسن کا مطالبہ ہے یہی
جو اُن کی راہ سے گزرے، وہ بے زباں گزرے

◎

اُن کی محفل ہے ، یہاں رنگ دِکھا اور بھی کچھ
اے دلِ داد طلب ! رقص میں آ اور بھی کچھ

خون آنکھوں سے بہانا ہے پُرانا کرتب
شعبدے اُن کو ذرا کُھل کے دِکھا اور بھی کچھ

جب بھی دیکھوں ، مجھے دُشنام دیا کرتے ہو
بات آتی ہے تمہیں اِس کے سِوا اور بھی کچھ؟

صرف پھولوں کی صباحت پہ نہیں میری نظر
کہہ گئی ہے مرے کانوں میں صبا اور بھی کچھ

مجھ کو تسلیم تری سحر بیانی قاصد !
صرف باتیں نہ بنا ، کام دِکھا اور بھی کچھ

آگ دب جائے ، ذرا سینے میں ٹھنڈک تو پڑے
مجھے کہہ لیجئے سرکار ! بُرا اور بھی کچھ

سادگی تو مرے رہزن کی یہ دیکھے کوئی
لُوٹ کر پوچھ رہا ہے کہ بچا اور بھی کچھ ؟

عام لوگوں کی زباں پر شہِ خوباں ہی نہیں
کہہ رہی ہے تجھے مخلوقِ خدا اور بھی کچھ

جب بھی ساقی نے مجھے پوچھ لیا ہنس کے نصیؔر
چُوم کر جام وہیں مَیں نے کہا اور بھی کچھ

◎

خاک وعدوں پہ ڈالتے جاؤ — تم ہمیں روز ، ٹالتے جاؤ

میرے گھر آؤ تو سہی اک بار — دل کی حسرت نکالتے جاؤ

پھُول بھی ہیں چمن میں، کانٹے بھی — دامنِ دل سنبھالتے جاؤ

عشق کرنا ، نہیں گناہ ، مگر — روگ ہے ، روگ پالتے جاؤ

بعض لوگوں کا ہے یہی دستور — سب پہ کیچڑ اُچھالتے جاؤ

شیخ صاحب ! کہاں چلے ، ٹھہرو — اپنا ساغر کھنگالتے جاؤ

ہم تمہارے ہُنر سے واقف ہیں — عیب ہم میں نکالتے جاؤ

ہوگیا خاک ، چاہنے والا — آؤ ! مٹّی تو ڈالتے جاؤ

کیا بھروسہ ہے زندگی کا نصیرؔ
دل کے ارماں نکالتے جاؤ

◎

یُوں محبّت میں شب و روز گزارے ہم نے
نام لے لے کے ترا، صدقے اُتارے ہم نے

ہم بھلا دیں تمہیں، یہ بات بہت مشکل ہے
یاد کر رکھّے ہیں، احسان تمہارے، ہم نے

اُن پہ عائد جو ہوئے پیشِ خدا، حشر کے دن
اپنے سَر لے لئے الزام وہ سارے ہم نے

لطف تو جب ہے اُسی لہر پہ بہتے جائیں
عہد جو کچھ کیئے دریا کے کنارے ہم نے

مُلتفت ہی نہ ہُوا کوئی ہماری جانب
گو نصیرؔ آج کیئے لاکھ اشارے ہم نے

◎

اب ترے طالبِ دیدار گزارا ہی کریں
تیری تصویر، تصوّر میں اُتارا ہی کریں

التجا ہے کہ یہ زحمت وہ گوارا ہی کریں
بات کرنی نہیں آتی تو اشارا ہی کریں

خود غرض لوگ، وفادار نہیں ہو سکتے
ایسے ویسوں سے حُضُور! آپ کنارا ہی کریں

قابلِ ذکر ہیں کچھ اور بھی دنیا کے حَسیں
کیا ضروری ہے کہ ہم ذکر تمہارا ہی کریں

میکدے میں جو چلے آئے تو رندی بھی سہی
شیخ جی! اب یہ خُرافات گوارا ہی کریں

اُس نے شکووں سے ہمیں روک دیا یہ کہہ کر
اپنی پروا نہیں، کچھ پاس ہمارا ہی کریں

وہ تو دنیا سے گیا، لَوٹ کے آنے سے رہا
اب وہ بیمارِ محبت کو پکارا ہی کریں

قُرب ممکن نہیں محفل میں نصیرؔ، اُن کا اگر
دُور سے بیٹھ کے صُورت کا نظارا ہی کریں

◎

طیش میں دورِ خزاں پاؤں پٹکتا ہی رہا
پُھول کھلتے ہی رہے، غنچہ چٹکتا ہی رہا

گُل کی تقدیر سے وابستہ رہی ایک خلش
دیدۂ خار میں ہر دم وہ کھٹکتا ہی رہا

دل کو حاصل نہ ہوئی منزلِ آرام و سکوں
اک مسافر تھا کہ رستے میں بھٹکتا ہی رہا

خاک بن بن کے قبا سے وہ لپٹنا میرا
جیب و داماں کو وہ ہر چند جھٹکتا ہی رہا

ایک تم تھے کہ خدائی نے سراہا تم کو
ایک مَیں تھا کہ نگاہوں میں کھٹکتا ہی رہا

رات میخانے سے پی کر ہی ٹلا واعظِ شہر
جام جب تک نہ مِلا اُس کو، مٹکتا ہی رہا

گام دو گام سے آگے تو نہ تھی محفلِ ناز
تیرا دیوانہ کھڑا پاؤں پٹکتا ہی رہا

لاکھ تدبیر نصیرؔ اہلِ جہاں کر بیٹھے
غم کا گجرا مری گردن میں لٹکتا ہی رہا

◎

لوگ دنیا میں پُراسرار نظر آتے ہیں
ہو کے مجبور بھی، مختار نظر آتے ہیں

شوخ، طرّار، طرحدار نظر آتے ہیں
وہ بھی کیا کیا دمِ گفتار نظر آتے ہیں

سربکف اُن کے خریدار نظر آتے ہیں
لوگ سر دینے پہ تیّار نظر آتے ہیں

اُن کو انگڑائی پہ انگڑائی چلی آتی ہے
میرے لُٹ جانے کے آثار نظر آتے ہیں

ترک ہے محفلِ احباب میں آنا جانا
آج کل سب سے وہ بیزار نظر آتے ہیں

اب جگر میں نہ کوئی پھانس، نہ دل میں ہے خلش
اُجڑے اُجڑے سے یہ بازار نظر آتے ہیں

کوئی پوچھے، تو یہی ایک پتہ ملتا ہے
اُن کے عُشّاق سرِ دار نظر آتے ہیں

اب تو پردے کا یہ عالم کہ الٰہی توبہ
صرف دن بھر میں وہ اک بار نظر آتے ہیں

بات ہے اُن کی مری، کام ہے کیا اوروں کا
لوگ کیوں بیچ میں دیوار نظر آتے ہیں

در پہ خورشیدِ سحَر بہرِ سلام آیا ہے
خوابِ راحت سے وہ بیدار نظر آتے ہیں

اللہ اللہ نصیرؔ اُن کی تجلّی کا اثر
ذرّے، آئینۂ اَسرار نظر آتے ہیں

◎

کہہ گیا اُن سے اپنے دھیان میں کیا　　سادگی تھی مرے بیان میں کیا

خون کے سحرکار چند آنسو　　رنگ بھرتے ہیں داستان میں کیا

اک تصوّر سے اُس کے ہے روشن　　ورنہ رکھّا ہے آسمان میں کیا

آج کے آدمی سے ظاہر ہے　　آدمیّت ہے اِس جہان میں کیا

معتبر اُن کی ہر ادا ٹھہری　　منفرد ہیں وہ آن بان میں کیا

زندگی آپ سے عبارت تھی　　اب دھرا ہے ہماری جان میں کیا

کیوں نہ پہنچے گا بامِ جاناں تک　　مُرغِ دل پست ہے اُڑان میں کیا؟

قصّۂ غم وہ کیوں نہیں سُنتے　　کچھ کمی ہے مرے بیان میں کیا؟

میرا اُن کا یہ فاصلہ تو نہ تھا　　آ گئے لوگ درمیان میں کیا

دفعتاً آپ ہو گئے برہم　　پھونک ماری کسی نے کان میں کیا؟

مجھ سے تم بات کیوں نہیں کرتے　　خار پیوست ہیں زبان میں کیا؟

ہوگئیں خاک حسرتیں دل کی
اے نصیرؔ اب ہے اِس مکان میں کیا

◎

دورِ لالہ زار تک ہے — یہ سماں ، بہار تک ہے

گردنوں میں یہ تناؤ — صِرف اقتدار تک ہے

کس پہ ، کس لیے ، پڑے کب — یہ خدا کی مار تک ہے

پھانس لے مجھے کہ چھوڑے — حُسنِ دل شکار تک ہے

میری مان لے ، نہ مانے — یہ مزاجِ یار تک ہے

اعتبار آدمی کا — اپنے اعتبار تک ہے

وہ خدا کرے نہ آئیں — لُطف ، انتظار تک ہے

مَیں کہاں ہُوں دیکھ لو گے — تیرگی ، غُبار تک ہے

میل جول آج کل کا — حدِ کاروبار تک ہے

سچ کا ہولناک رستہ — کربلا سے دار تک ہے

ماجرا تو کہہ سُناؤں — بات اعتبار تک ہے

اے نصیر ! دُور اپنی
آستانِ یار تک ہے

◎

دل کی دھڑکن کہ جاں سے آتی ہے
اُن کی خُوشبو ، کہاں سے آتی ہے

حدِ اوہام سے گزر کے کھُلا
خوش یقینی ، گُماں سے آتی ہے

جرأتِ بندگیِ ربِّ جلیل
بُت شکن کی اذاں سے آتی ہے

ایسی طاقت کہ جو نہ ہو تسخیر
دل میں عزمِ جواں سے آتی ہے

اُن کی آواز میرے کانوں میں
آ رہی ہے ، جہاں سے آتی ہے

سَر کو توفیق سجدہ کرنے کی
یار کے آستاں سے آتی ہے

آدمیت وہاں نہیں ہوتی
کبر کی بُو جہاں سے آتی ہے

وقت کیسا قیامتی ہے آج
دھوپ اب سائباں سے آتی ہے

رات پڑتے ہی کچھ نہیں کُھلتا
یادِ جاناں کہاں سے آتی ہے

آدمی میں جمالیاتی حِس
قُربتِ مہ وشاں سے آتی ہے

دو قدم چل کے تم نہیں آتے
چاندنی آسماں سے آتی ہے

زندگی میں نصیرؔ ! آسانی
ترکِ سُود و زیاں سے آتی ہے

یاد فن کے اساتذہ کی نصیرؔ
تیرے طرزِ بیاں سے آتی ہے

◎

اُجڑ گیا ہے چمن ، لوگ دلفگار چلے
کوئی صبا سے کہو اب نہ بار بار چلے

یہ کون سیر کا ارماں لئے چمن سے گیا
کہ بادِ صبح کے جھونکے بھی سوگوار چلے

یہ کیا کہ کوئی بھی رویا نہ یاد کر کے اُنہیں
وہ چند پُھول جو حُسنِ چمن نکھار چلے

نقاب اُٹھا کہ پڑے اہلِ درد میں ہلچل
نظر ملا کہ چُھری دل کے آر پار چلے

خوشا کہ در پہ ترے سر جُھکا لیا ہم نے
یہ ایک قرضِ جبیں تھا جسے اُتار چلے

کہے جو حق وہ کرے کیوں مآلِ حق سے گریز
کوئی چلے نہ چلے ہم تو سُوئے دار چلے

اب اِس کے بعد چمن جانے یا صبا جانے
گزارنے تھے ہمیں چار دن ، گزار چلے

پلٹ کے دیکھا نہ اک بار کارواں نے ہمیں
گرے پڑوں کی طرح ہم پسِ غُبار چلے

جو اُن کی یاد میں چمکے کبھی سرِ مژگاں
وہ چار اشک مری عاقبت سنوار چلے

کسی کی یاد سے تسکینِ جاں ہے وابستہ
کسی کا ذکر چلے اور بار بار چلے

تمہاری بزم سے تاثیر اُٹھ گئی شاید
بحالِ زار ہم آئے ، بحالِ زار چلے

غریبِ شہر کی میّت کے ساتھ روتا کون
مرا سلام ہو اُن پر جو اشکبار چلے

قفس میں روز دکھاتا ہے آشیاں صیّاد
نصیرؔ آگ لگا دوں جو اختیار چلے

◎

کہہ دو ہٹ جائیں میری راہوں سے
کیا غرض مجھ کو کج کلاہوں سے

اتفاقاً مرا دلِ مضطر
بچ گیا آپ کی نگاہوں سے

شیشہ و جام کی ضرورت کیا
تم پلاؤ اگر نگاہوں سے

سوزِ غم نے جلا دیا دل کو
جل گیا رات دن کی آہوں سے

رحمتیں اُس کی دیکھ کر انساں
باز آتا نہیں گناہوں سے

کانپتے ہیں دل و جگر دونوں
آپ سے ، آپ کی نگاہوں سے

غم کی راہیں سفر میں لازم ہیں
کیا بچے کوئی غم کی راہوں سے

جن سے لُوٹا تھا تم نے میرا دل
دیکھ لو پھر اُنہیں نگاہوں سے

ہم پریشان ہیں محبّت میں
خیر خواہی سے ، خیر خواہوں سے

وہ کہیں کا نہیں خدا کی قسم
گِر گیا جو تری نگاہوں سے

مَیں سوالی ہُوں اے نصؔیر اُن کا
کام کیا مجھ کو بادشاہوں سے

◎

مری نظر سے مکمل بہار گزری ہے
کہ مُسکراتی ہُوئی شکلِ یار گزری ہے

غم والم کے، اذیّت کے، کرب زاروں میں
تڑپ تڑپ کے شبِ انتظار گزری ہے

نَفَس نَفَس پہ چُبھن تھی قدم قدم پہ خلش
تمام عُمر سرِ نوکِ خار گزری ہے

قفَس میں حال نہ پوچھا صبا نے آ کے کبھی
مرے قریب سے بیگانہ وار گزری ہے

سکونِ دل نہ میسّر ہُوا زمانے میں
نصؔیر زیست بڑی بے قرار گزری ہے

◎

اُن کے جلووں نے عجب رنگ جما رکّھا ہے
بزمِ کونین کو دیوانہ بنا رکّھا ہے

نبض ساکت ہُوئی ، دَم کھنچ کے لبوں پر آیا
اب جو آؤ بھی تو بیمار میں کیا رکّھا ہے

شاید آ پہنچیں دمِ نزع وہ بالیں پہ مری
ملک الموت کو باتوں میں لگا رکّھا ہے

اب تو پردے سے نکل چاند سی صورت والے !
شبِ فرقت نے اک اندھیر مچا رکّھا ہے

تیرے اندازِ نظر دیکھنے آ جاتا ہُوں
ورنہ میرے لئے میخانے میں کیا رکّھا ہے

آئینہ حُسن میں تحلیل نہ ہو جائے کہیں
تیری تصویر کو سینے سے لگا رکّھا ہے

تیرے قُرباں ، تری اُس یاد کے لمحے پہ نثار
جس نے شب بھر مجھے مصروفِ دُعا رکّھا ہے

کیا نصیؔر آنکھ اُٹھے ساغر و مینا کی طرف
اُن کی آنکھوں نے مجھے مست بنا رکّھا ہے

◎

شعرِ حضرتِ سعدی شیرازیؒ

بزیور ہا بیا رایند وقتے خوبرویاں را
تو سیمیں تن چناں خُوبی کہ زیور ہا بیارائی

منظوم ترجمہ از نصیر

حسینوں کے بدن کی وجہِ آرائش تو ہیں زیور
مگر آرائشِ زیور کا باعث ہے بدن تیرا

◎

شعرِ مولٰنا گرامی جالندھریؒ

خموشی با تکلّم در ستیزہ
تبسّم درمیانش ریزہ ریزہ

منظوم ترجمہ از نصیر

ٹھنی ہے گُفتگو کی اور خاموشی کی آپس میں
پِسا جاتا ہے بے چارہ تبسّم، درمیاں ہو کر

◎

رباعی از

حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ

مردانِ خدا مَیل بہ ہستی نکنند
خود بینی و خویشتن پرستی نکنند
آنجا کہ مجرّدانِ حق مے نوشند
خمخانہ تہی کنند و مستی نکنند

منظوم ترجمہ از نصیر

مردانِ خدا رغبتِ ہستی نہیں کرتے
یہ لوگ کبھی نفس پرستی نہیں کرتے
پیتے ہیں جہاں اہلِ صفا بادۂ عرفاں
میخانہ بھی پی جائیں تو مستی نہیں کرتے

◎

شعرِ حضرتِ بیدلؒ

سُخن باشد دلیلِ زندگی روشن خیالاں را
غمِ مُردن ندارد شعلۂ ما ، تا زباں دارد

منظوم ترجمہ از نصیر

کلام روشن خیال لوگوں کا اُن کی بُرہانِ زندگی ہے
نہیں بُجھے گا ہمارا شُعلہ، ہے جب تک اِس کی زبان باقی

◎

شعرِ حضرتِ مولنا جامیؒ

بندۂ عشق شُدی ترکِ نَسَب کُن جامی !
کہ دریں راہ ، فُلاں ابنِ فُلاں چیزے نیست

منظوم ترجمہ از نصیر

بندۂ عشق ہے جامی ! نَسَبی کِبر کو چھوڑ
کہ فلاں ابنِ فلاں کچھ نہیں اِس رستے میں

◎

شعرِ حضرتِ بیدلؒ

در زندگی مطالعۂ دل غنیمت است
خواہی بخوان و خواہ مخواں، مانوشتہ ایم

منظوم ترجمہ از نصیر

حیات میں ہے غنیمت مطالعہ دل کا
کوئی پڑھے نہ پڑھے ، ہم نے داستاں لکھ دی